ایک بچہ ایک چور

ایک بچہ ایک چور

بچوں کے لئے ایک ناول

ایرک کاسٹنر

ابو ضیا اقبال

۱۹۹۲

فہرست

کراچی کا سفر

"بیٹے امین" ماں نے آواز دی۔ "ذرا قینچی تو لے آؤ۔"

امین اُٹھا اور کمرے میں سے قینچی لا کر ماں کو دے دی۔ وہ ایک عورت کی قمیص کا ناپ لے رہی تھی۔

امین اس عورت کو پہچانتا تھا۔ وہ تنور والے کی بیوی کریمن تھی۔ ”خالہ سلام علیکم“ اس نے کہا۔

”جیتے رہو، بیٹے“ کریمن نے دُعا دی۔ ”میں نے سُنا ہے کہ کراچی جارہے ہو؟ مبارک ہو۔“

امین کی امّی بولیں، ”کراچی میں اس کی خالہ اور نانی رہتی ہیں۔ وہ بہت دنوں سے بُلارہے ہیں لیکن مجھے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اب امین کی چھٹیاں ہوئیں تو میں نے سوچا کہ اسے ہی بھیج دوں۔ ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے۔ اکیلا بھی جا سکتا ہے۔ نانی اسٹیشن پر لینے آجائیں گی۔ انہوں نے خط میں لکھا ہے کہ میں ٹکٹ گھر کے پاس ملوں گی۔“

”اسے کراچی ضرور پسند آئے گا۔ وہاں بچّوں کا دل خوب لگتا ہے۔ لیکن میرا تو ایک ہی دن میں دل گھبرا گیا تھا۔ شور وغُل اتنا ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ بازار میں نکل جاؤ تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے آدمیوں کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے۔“ کریمن

نے کہا۔

”کیا وہاں دوسرے ملکوں کے لوگ بھی ہیں؟“ امین نے پوچھا۔

”میں نے خیال نہیں کیا۔ لیکن کیوں نہیں ہوں گے۔“ کریمن نے جواب دیا۔
”کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ اپنا حیدر آباد تو اس کا ایک محلّہ ہے۔“

”اچھا امین، اب تم جانے کی تیّاری کرو۔“ ماں بولی۔ ”میں نے تھیلے میں تمہارے کپڑے رکھ دیے ہیں۔ ایک جوڑا باہر ہے۔ کپڑے بدل لو تو کھانا کھائیں۔“

”میں قمیص کون سی پہنوں گا؟“ امین نے پوچھا۔

”وہی جو میں نے نکالی ہے۔ پہلے نہا لو جا کر۔“ ماں نے کہا۔ ”اور جوتوں میں نئے فیتے بھی ڈال لو۔ جاؤ جلدی کرو۔“

”بہت اچھا امّی۔“ امین یہ کہہ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد کریمن چلی گئی تو امین کی ماں اُٹھ کر دُوسرے کمرے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ امین مُنہ بگاڑے

کھڑا ہے۔ ماں کو دیکھتے ہی بولا۔

”یہ قمیص پہن کر جاؤں گا مَیں؟ اس کا تو رنگ بھی اُڑ گیا ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ بہت سے بچّوں کو تو یہ بھی نصیب نہیں۔ تمھیں نظر نہیں آتا کہ کتنی مشکل سے ہمارا گزارا ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی اور بولی۔ ”اب اور کیا رہ گیا ہے؟ ہاں، نانی کو دینے کے لیے کچھ پیسے دوں گی۔ چلو اب کھانا کھالو۔“

اُس نے امین کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور باورچی خانے میں لے گئی۔

دسترخوان پر امین کی دِل پسند چیزیں رکھّی تھیں۔ وہ خوب مزے لے لے کر کھانے لگا۔ ساتھ ساتھ ماں کی طرف بھی دیکھا جاتا تھا لیکن وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”جاتے ہی خط لکِھنا۔ میں نے تھیلے میں لفافہ رکھ دیا ہے۔“ ماں نے کہا۔

”بہت اچھا۔“ امین نے کہا۔

”سب کو بہت بہت سلام دعا کہنا۔“ ماں کہنے لگی۔ ”اور ان کے ہاں بد تمیزی نہ کرنا۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی تمہیں برا کہے۔“

”بہت اچھا امّی۔“ امین نے وعدہ کیا۔

کھانا کھا کر ماں نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا ڈبّا نکالا۔ اس میں روپے تھے۔ وہ اُنہیں گِننے لگی۔

”چھ روپے کم ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”کیسے دیے؟“

”صبح دودھ والا آیا تھا۔“ امین نے یاد دِلایا۔

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔“ ماں کو اطمینان ہو گیا۔

”دیکھو، چھ کم سَو روپے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”کتنے ہوئے؟“

”چورانوے۔“ امین نے جھَٹ حساب لگا کر بتا دیا۔

"ہاں چورانوے روپے۔ دس دس کے سات، پانچ پانچ کے چار اور باقی روپے رُوپے کے نوٹ ہی۔ پچاسی روپے اپنی نانی کو دنیا۔ کہنا کہ ناراض نہ ہوں۔ میرا ہاتھ تنگ تھا اس لیے زیادہ نہ بھیج سکی۔ باقی روپے تم اپنے لیے رکھ لینا اور کرایہ دے کر جو بچے اُسے خُوب سوچ سمجھ کر خرچ کرنا۔ فضول خرچی بالکل نہ کرنا۔"

ماں نے نوٹ ایک لفافے میں رکھے اور اسے امین کو دے کر کہا۔ "اسے کہاں رکھو گے بھلا؟"

امین نے لفافے کو قمیص کی جیب میں رکھا اور اُوپر سے جرسی پہن لی۔ "اب بتایئے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"شاباش۔" ماں نے کہا "گاڑی میں کسی کو معلوم نہ ہو کہ تمہاری جیب میں پیسے ہیں۔"

"تو کیا میں لوگوں کو بتاتا پھروں گا؟" امین نے منہ پھُلا کر کہا۔

ماں نے ہنس کر اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسٹیشن جانے کی تیّاری کرنے

لگی۔

یوں تو چورانوے روپے اتنی بڑی رقم نہ تھی بعض لوگ اتنے روپے ایک دن میں خرچ کر دیتے ہیں۔ لیکن غریب آدمی کے لیے یہ بہت ہیں۔ امین کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اس کی ماں اپنا اور اس کا پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ اسے نہ صرف گھر کا خرچ پورا کرنا پڑتا تھا بلکہ مکان کا کرایہ، امین کے سکول کی فیس اور کتابوں کے لیے پیسے بھی نکالنے پڑتے۔ اس کے علاوہ ہر مہینے اپنی ماں کو بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا جو کراچی میں اپنی دوسری لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ کبھی کبھار وہ بیمار پڑتی تو اس کی فکر بڑھ جاتی اور دوا دارو کے لیے اسے دوسرے خرچ کم کرنا پڑتے۔

ایسے موقع پر امین ماں کی بہت خدمت کرتا۔ وہ اس کی دیکھ بھال کے علاوہ گھر کی صفائی کرتا اور کچّا پکّا کھانا بھی پکاتا۔ وہ بہت سمجھ دار لڑکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ماں اس کی خاطر کتنی تکلیف اٹھا رہی ہے۔

امین کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ وہ ایسا کوئی کام نہ کرتا جس سے ماں کے دل کو تکلیف پہنچے۔ خُوب دل لگا کر پڑھتا اور جماعت میں ہمیشہ اوّل آتا۔ اس کی ماں کو پورا بھروسا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا اور اس کی ساری تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔

جب ساری تیّاریاں ہو چکیں تو ماں نے کہا۔ "گاڑی کا وقت ہونے والا ہے۔ ٹھیک دو بجے چلتی ہے۔ چلو چلیں۔"

"چلیے امّی۔" امین نے کہا اور کپڑوں کا تھیلا اُٹھا لیا۔

باہر نکل کر اس نے کہا۔ "کوئی تانگہ آئے تو اسے روک لو۔"

اسی وقت گلی کے موڑ پر ایک تانگہ نظر آیا۔ امین نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کو کہا اور دونوں تانگے میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

حیدر آباد اتنا بڑا شہر نہیں ہے۔ تانگہ آدھ گھنٹے میں اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہ دونوں اُتر کر ٹکٹ گھر پر گئے۔ ماں نے امین کے لیے ایک ٹکٹ کراچی کا اور اپنے لیے ایک

پلیٹ فارم ٹکٹ لیا۔ دونوں پلیٹ فارم پر پہنچے۔

”تھیلا اپنے پاس رکھنا۔“ اس نے آخری مرتبہ نصیحت کی۔ ”ہوشیاری سے بیٹھنا۔ اجنبی لوگوں سے زیادہ باتیں مت کرنا اور کرنا بھی تو تمیز سے۔ کسی کو یہ نہ بتانا کہ تمہارے پاس روپے ہیں۔“

روپے کا نام سُنتے ہی امین کا ہاتھ فوراً جیب پر گیا۔

”آپ بالکل فکر نہ کریں امّی۔“ اس نے ماں کو یقین دلایا۔ ”میں کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔“

اُس نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑوں کی طرح اُسے دلاسا دینے لگا۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ جاتے ہی خط لکھوں گا۔ زیادہ کام نہ کرنا۔ بیمار ہو جائیں گی تو دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں وہاں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہُوں گا۔“

اتنے میں گاڑی آگئی۔ ماں نے اس کا مُنہ چُوما اور وہ لپک کر ایک ڈبّے میں سوار ہو گیا۔

”نانی ٹکٹ گھر کے قریب ملیں گی۔“ ماں نے کہا۔ ”خالہ، خالو اور نانی کو بُہت بُہت سلام کہنا اور ننھی حمیدہ کو پیار۔ اس سے لڑنا جھگڑنا مت۔ جاتے ہی خط لکھنا۔ ورنہ مجھے فکر رہے گی۔“

اگر انجن نے سیٹی نہ دی ہوتی تو ماں کی نصیحتیں نہ جانے کب تک جاری رہتیں۔ اتنے میں گارڈ نے سبز جھنڈی دکھائی اور گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔

ماں ہاتھ ہلاتی رہی۔ جواب میں امین بھی ہاتھ ہلا رہا تھا۔ بیٹے کی جدائی سے ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ یہی کچھ حال امین کا بھی تھا۔ جب گاڑی تیز ہو گئی اور ماں نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے کھڑکی میں سے سر نکال لیا اور ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔

کالی ٹوپی والا

ڈبّے میں بہت سے آدمی تھے، بوڑھے، جوان عورتیں بچّے۔

امین کے پاس دائیں طرف ایک موٹی سی عورت بیٹھی تھی۔ وہ تھوڑا سا بائیں

جانب کھسک گیا تا کہ عورت آرام سے بیٹھ جائے۔ یہ دیکھ کر وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے بولی۔ ”بہت تمیز دار بچّہ ہے۔ آج کل ایسے بچّے کہاں؟“

اس کے ساتھی نے ایک گہری سانس لی اور کہنے لگا۔ ”جب ہم چھوٹے تھے تو زمانہ ہی اور تھا۔“

امین اس قسم کی باتیں پہلے بھی سُن چکا تھا۔ اِس لیے اُس نے کوئی خیال نہ کیا۔ بعض لوگ ہمیشہ اگلے وقتوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ گویا اس زمانے میں کوئی بات اچھّی ہے ہی نہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اب ہوا بھی اتنی صاف نہیں ہے جتنی پہلے تھی۔ بات یہ ہے کہ ایسے لوگ خوش نہیں رہتے اسی لیے وہ اگلے وقتوں کو یاد کر کر کے آہیں بھرتے ہیں۔

امین نے جیب کو ہاتھ لگا کر دیکھا پیسے موجود تھے۔ ڈبّے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ شریف اور ایمان دار نظر آتے تھے۔ ان میں کوئی بھی چور یا اُچکّا دکھائی نہ دیتا تھا۔ کھڑکی کے پاس کالی ٹوپی پہنے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے جیب سے ٹافی

نکالی اور امین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے کھاؤ گے؟“

”جی نہیں، شکریہ۔“ امین نے رُکھائی سے جواب دیا۔ پھر اسے ماں کی نصیحت یاد آگئی اور وہ ادب سے بولا۔ ”آپ کا بُہت بُہت شکریہ جناب۔“

سب مسافر مُسکرانے لگے۔ کالی ٹوپی والے نے کہا۔ ”بہت اچھّے بچّے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی امین۔“ اس نے نام بتایا۔

موٹی عورت نے پوچھا۔ ”تم سعیدہ درزن کے لڑکے تو نہیں ہو؟“

یہ سن کر امین حیران رہ گیا۔ موٹی عورت نے اس کی حیرانی دور کر دی اور بولی۔ ”بُہت اچھّے کپڑے سیتی ہے تمہاری ماں۔ میں نے بھی اسی سے کپڑے سلوائے ہیں، تمہارے پڑوس میں خان صاحب رہتے ہیں نا؟“

امین نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔ موٹی عورت بولی۔ ”ان کی بیوی کو میرا

سلام کہنا۔"

"لیکن میں تو کراچی جا رہا ہوں۔" امین نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن گھر واپس تو جاؤ گے نا؟" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ امین شرمندہ ہو گیا۔

"اچھا، تو تُم کراچی جا رہے ہو۔" کالی ٹوپی والے نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ نانی امّاں مجھے اسٹیشن پر لینے آئیں گی۔" امین نے کہا۔ "وہ ٹکٹ گھر کے پاس میرا انتظار کریں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر جیب کو چھوا۔ روپے جیب میں موجود تھے۔ لیکن اس کے چھُونے سے لفافہ کھڑکنے کی آواز آئی جس سے وہ کچھ گھبرا گیا۔

"تم پہلے کبھی کراچی گئے ہو؟" کالی ٹوپی والے نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" امین نے جواب دیا۔

”تو بس پھر تمہارا خدا ہی حافظ ہے۔“ کالی ٹوپی والے نے کہا۔ ”کراچی شہر نہیں۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ دنیا بھر کے لُچے لفنگے اور بدمعاش وہاں جمع ہو گئے ہیں۔ چور ایسے کہ آنکھوں کا کاجل چُرا لیں۔ اکیلے دُکیلے بچّے کی تو خیر نہیں۔ میاں، اکیلے گھر سے مت نکلنا ورنہ کوئی اُٹھا کر لے جائے گا۔“

اچانک ایک دوسرے مسافر نے اس کی بات کاٹی اور بولا۔ ”کیوں خواہ مخواہ بچّے کو ڈرا رہے ہو۔ بُرے بھلے ہر جگہ ہوتے ہیں۔“

دونوں میں جھڑپ ہو گئی اور وہ دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ لیکن امین چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں بھی خاموش ہو گئے۔

امین کو بھُوک لگنے لگی۔ اس نے تھیلے میں سے روٹی نکالی اور مزے لے لے کر کھانے لگا۔ اتنے میں کوٹری اسٹیشن آ گیا۔ گاڑی رُکتے ہی ڈبّے کے مسافر اُتر گئے۔ صرف امین اور کالی ٹوپی والا رہ گئے۔

موٹی عورت نے کھڑکی میں سے کہا۔ ”خان صاحب کی بیوی کو میرا اسلام کہنا نہ

بھُولنا۔“

امین نے سر ہلا کر وعدہ کیا اور وہ مُسکراتی ہُوئی چلی گئی۔

امین کالی ٹوپی والے کے ساتھ ڈبّے میں اکیلا رہ گیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُسے اس آدمی سے خُوف سا آنے لگا۔ جب گاڑی چلی تو وہ غُسل خانے میں گھس گیا اور لفافہ جیب سے نکالا۔ روپے گِنے اور سوچنے لگا کہ انہیں کس طرح حفاظت سے رکھے۔ اسے یاد آیا کہ پتلون کی پیٹی میں ایک آل پِن لگی ہوئی ہے۔ اس نے جھٹ پن نکالی۔ اس سے نوٹوں کو لفافے کے ساتھ نتھّی کیا اور لفافے کو قمیص کی جیب میں رکھ کر اندر سے پِن لگالی۔ اسی طرح جیب بھی بند ہو گئی اور نوٹ بھی محفوظ ہو گئے۔ وہ ِگر بھی نہ سکتے تھے۔ اور کوئی نکالنا چاہتا تو نکال بھی نہ سکتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ اور اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ کالی ٹوپی والا دوسری سیٹ پر پاؤں پھیلائے سو رہا تھا اس کے خرّاٹوں کی آواز آرہی تھی۔

یہ دیکھ کر امین خُوش ہو گیا کہ اس مصیبت سے جان چھوٹی۔ وہ مزے سے باہر کا

منظر دیکھنے لگا۔ درخت، میدان، مویشی اور کسان تیزی سے نظروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں گراموفون کے ریکارڈ پر بٹھا دیا گیا ہو اور وہ تیزی سے گھوم رہے ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اس منظر سے اُکتا گیا۔ اس کا دل چاہا کہ اُٹھ کر ڈبّے میں گھومے پھرے۔ لیکن اس خیال سے کہ کالی ٹوپی والا جاگ جائے گا وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے سامنے والی سیٹ پر پاؤں پھیلا دیے اور اس آدمی کو غور سے دیکھنے لگا۔

اس شخص نے ٹوپی کو پیشانی پر رکھ لیا تھا جس سے اس کی آنکھیں چھُپ گئی تھیں۔ اس کا چہرہ لمبا تھا اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ کان پتلے پتلے اور اُوپر کو اُٹھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے مکّاری ٹپکتی تھی۔ اُس کی ٹھوڑی پر زخم کا نشان تھا۔ امین نے غور سے دیکھا تو ایسا ہی نشان دائیں آنکھ کے اُوپر بھی نظر آیا۔ اس کی بھویں گھنی تھیں اور جسم مضبُوط اور چُست۔

اس آدمی نے خاکی پتلون اور نیلے رنگ کی پھول بوٹوں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ہوائی چپّل تھی۔ کنپٹی اور گردن پر بال تھے۔ سر گنجا تھا اسی لیے شاید اُس نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔

اچانک امین اُچھل پڑا۔ اسے نیند آرہی تھی۔ وہ تَن کر بیٹھ گیا تاکہ نیند بھاگ جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی تیسرا مسافر بھی ڈبّے میں آجائے۔ وہ اس خطرناک

آدمی کے ساتھ اکیلا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی نہ آیا۔ گاڑی کئی جگہ پر رُکی۔ دوسرے ڈبّوں سے مسافر اُترے اور چڑھے بھی لیکن اس کے ڈبّے میں کسی نے پاؤں نہ رکھا۔

امین کو نیند بھگانے کے لیے ایک ترکیب سُوجھی۔ وہ اپنی ٹانگوں میں چُٹکیاں لینے لگا۔ یہ ترکیب وہ اِمتحان کے دنوں میں استعمال کرتا تھا تاکہ نیند نہ آجائے اور وہ پڑھ سکے۔

پھر اس نے اپنی خالہ زاد بہن حمیدہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ اب وہ کیسی لگتی ہوگی۔ اس نے حمیدہ کو کئی سال سے دیکھا نہ تھا۔ صرف ایک مرتبہ جب وہ چھوٹی سی تھی تو خالہ اور نانی کے ساتھ حیدر آباد آئی تھی۔ اس وقت ان میں لڑائی بھی ہوگئی تھی لیکن امین نے اس سے کچھ نہ کہا تھا۔ وہ چھوٹی سی تھی اور کمزور تھی۔ لیکن وہ پھر بھی اکڑتی تھی۔ آخر خالہ نے اسے ڈانٹ پلائی تب کہیں وہ سیدھی ہوئی۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔ لیکن وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور پھر ٹانگوں میں چٹکیاں لینے لگا۔

چٹکیاں لیتے لیتے وہ تھک گیا تو ڈبّے کی چھت پر لگے ہوئے لکڑی کے تختوں کو گننے لگا۔ ایک طرف سے گنا تو چوبیس تھے۔ دوسری طرف سے گنا تو تیئیس۔ اس نے پھر گِننا شروع کیا۔ لیکن تیئیس تک پہنچنے سے پہلے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس کا سر سِیٹ کی پُشت سے لگ گیا۔

بھیانک خواب

امین کو ایسا لگ رہا تھا جیسے گاڑی ایک دائرے کی شکل میں چل رہی ہے۔ انجن آخری ڈبے سے مل رہا ہے۔ جیسے کتّا اپنی دم کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دائرے میں درخت اور گھاس کے میدان آ گئے تھے۔ اسے عمارتیں بھی نظر آئیں جو بہت اونچی تھیں۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ گھڑی نکال کر وقت دیکھے لیکن اس کے ہاتھ میں گھر کی دیوار پر لگا ہوا بڑا گھڑیال آ گیا۔

پھر اس نے کھڑکی میں سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہے کہ انجن آخری ڈبے سے ٹکرانے ہی والا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے ڈبّے کا دروازہ کھولا اور پائدان پر پاؤں رکھ کر انجن کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ڈرائیور سو گیا ہے۔

اس طرح چلتے ہوئے اس نے ہر ڈبّے میں جھانکا۔ تمام ڈبّے خالی تھے اور ساری ٹرین میں اس کے اور کالی ٹوپی والے کے سوا کوئی نہ تھا۔

امین نے دیکھا کہ کالی ٹوپی والا کچھ کھا رہا ہے۔ شاید وہ ٹافیاں کھا رہا تھا۔ اس نے انجن کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن کالی ٹوپی والا ہنسنے لگا۔ وہ کھاتا جاتا تھا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ کتنی مزے دار ٹافیاں ہیں۔ ناچار امین انجن کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے اس کے قریب پہنچا اور بہت کوشش سے

اوپر چڑھا۔

اچانک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ انجن نہیں، بگھّی ہے۔ ڈرائیور اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لگام اور دوسرے میں ایک چابک تھی۔ جس سے وہ گھوڑوں کو مار رہا تھا اور گھوڑے پوری ٹرین کو کھینچے لیے جا رہے تھے۔ وہ کُل نو تھے اور ان کے سُموں پر چاندی کے گھنگھرو بندھے تھے۔ وہ پٹڑی پر ناچتے گاتے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔

امین نے ڈرائیور کو زور زور سے ہلایا اور چلّانے لگا۔ ”روکو، روکو، حادثہ ہونے والا ہے۔“ لیکن اس شخص نے گاڑی نہیں روکی۔

امین کو آخری ڈبّے کی چھت پر وہ عورت نظر آئی جو ڈبّے میں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ گھوڑوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن گھوڑے رُکنے کا نام نہ لیتے تھے۔

امین نے گھوڑے والے سے کہا۔ ”اگر گاڑی روک دو تو میں تمہیں دس روپے

دوں گا۔"

لیکن اس نے جواب دیا۔ "فضول باتیں مت کرو۔" اور یہ کہہ کر گھوڑوں کو زور زور سے چابک مارنے لگا۔

اب امین سے نہ رہا گیا۔ وہ انجن سے کود پڑا اور ڈھلان پر قلابازیاں کھانے لگا۔ لیکن اُسے چوٹ بالکل نہ آئی۔ وہ وہیں لیٹ کر گاڑی کو دیکھنے لگا جو اب رُک گئی تھی اور سب گھوڑے سر گھُما کر اسے دیکھ رہے تھے۔

یکایک گھوڑے والے نے گھوڑوں کو چابک لگائی اور بولا۔ "اس لڑکے کے پیچھے چلو۔"

گھوڑے تیزی سے امین کی طرف دوڑے۔ ان کے پیچھے گاڑی اس طرح اُچھل رہی تھی جیسے ربڑ کی گیند ہو۔

امین جلدی سے اٹھا اور جتنا تیز دوڑ سکتا تھا، دوڑنے لگا۔ سامنے ایک بڑی عمارت نظر آ رہی تھی۔ وہ اسی سمت دوڑنے لگا۔ ساتھ ہی مُڑ کر پیچھے بھی دیکھتا جاتا تھا۔

گاڑی بھی تیزی سے آ رہی تھی۔ درخت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گِر رہے تھے۔ صرف ایک بڑا سا برگد کا درخت باقی رہ گیا۔ امین نے دیکھا کہ درخت کی چوٹی پر وہ موٹی عورت بیٹھی، اپنے پاؤں کو مَل رہی ہے۔

امین عمارت کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دھکّا دے کر اس کا دروازہ کھولا اور اندر گھُس گیا۔ عمارت خالی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ باہر آیا۔

وہ چاہتا تھا کہ کسی جگہ چھپ جائے۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ لیکن گھوڑے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اسے عمارت کے پیچھے لوہے کا زینہ نظر آیا۔ وہ اس پر چڑھنے لگا۔ چڑھتے ہوئے وہ منزلیں گنتا جاتا تھا۔ پچاسویں منزل پر پہنچ کر وہ رُک گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ اسے درخت ننھے مُنّے دکھائی دیے اور ایک کارخانہ تو اِتنا چھوٹا نظر آیا کہ بڑی مشکل سے اسے پہچان سکا۔

پھر اسے ٹرین نظر آئی۔ وہ کانپنے لگا۔ گھوڑے بھی اسی زینے سے اُوپر آ رہے

تھے۔ وہ تیزی سے اُوپر چڑھنے لگا۔ وہ منزلیں گِنتا جاتا تھا۔ سو۔۔۔ ایک سو بیس۔۔۔ ایک سو چالیس ۔۔۔ ایک سو ساٹھ ۔۔۔ ایک سو اسّی۔۔۔ ایک سو نوّے۔۔۔ اور دوسو۔ وہ اب عمارت کی چھت پر پہنچ چکا تھا اور حیران کہ اب کیا کرے۔

اسے اپنے پیچھے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آئی اور وہ پھر تیزی سے دوڑنے لگا اور دوڑتے دوڑتے چھت کے سِرے تک پہنچ گیا۔ اب اور آگے نہیں دوڑ سکتا تھا۔ گھوڑے سرپر آپہنچے تھے۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا اور اُسے اپنے سر پر چھتری کی طرح پھیلا کر نیچے کُود پڑا۔

اُس نے اپنے پیچھے ڈبّوں کے ٹکرانے کی آواز سُنی۔ لیکن اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے خُود کو میدان میں گِرا ہوا پایا۔

وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ تھک کر چور ہو گیا تھا اور آنکھیں کھولنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھنے کے لے کر گاڑی کا کیا حال ہوا، اس نے آنکھیں کھولیں۔

اس نے دیکھا کہ گھوڑوں نے اپنے سروں پر چھتریاں تان رکھی ہیں اور انجن ڈرائیور کے ہاتھ میں بھی چھڑی ہے۔ وہ ہوا میں اڑتے ہُوئے تیزی سے میدان کی طرف آرہے تھے۔ ان کے پیچھے گاڑی بھی اُڑی چلی آرہی تھی۔
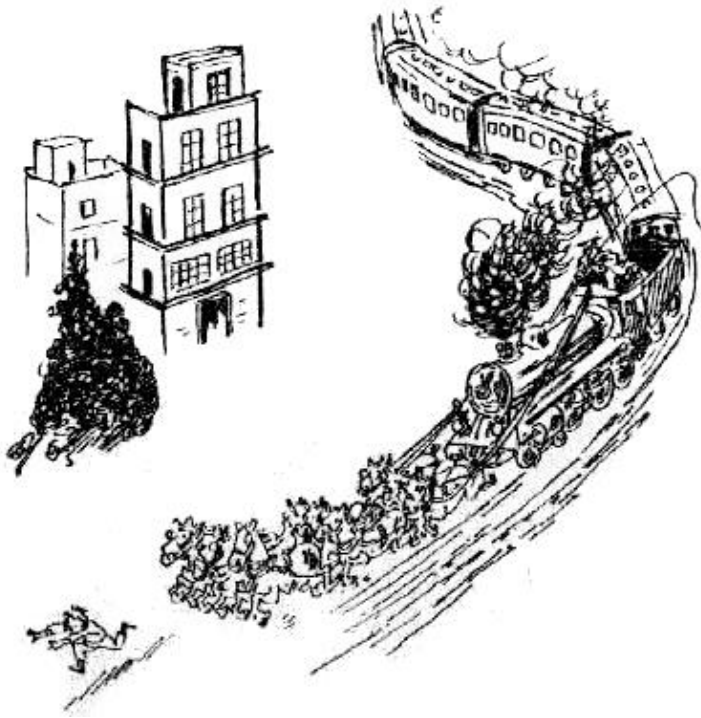
جُوں جُوں گاڑی نیچے آرہی تھی، اس کے ڈبّے بڑے ہوتے جارہے تھے۔ امین جلدی سے اُٹھا اور میدان میں دوڑنے لگا۔ سامنے ایک کارخانہ تھا جس کی

دیواریں شیشے کی تھیں۔ اسے دیواروں کے پار اپنی ماں نظر آئی جو کریمن کی قمیص سی رہی تھی۔ کریمن بھی پاس بیٹھی تھی۔

ماں کو دیکھ امین کی جان میں جان آئی۔ وہ اندر داخل ہوا اور چلّا کر بولا۔ ’’امّی میں کیا کروں؟‘‘

’’کیا ہوا بیٹا؟‘‘ اس کی ماں نے مشین چلاتے ہوئے اس طرح کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

’’ذرا باہر تو دیکھیے۔‘‘ وہ کانپتا ہوا بولا۔

ماں نے سر اٹھا کر دیکھا، گھوڑے گاڑی کو کھینچتے بھاگتے چلے آرہے تھے۔

’’یہ کیوں آرہے ہیں؟‘‘ اس کی ماں نے پوچھا۔

’’انجن ڈرائیور میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔‘‘ امین نے کہا۔

’’ہائے اللہ، میں کیا کروں؟‘‘ ماں نے گھبرا کر کریمن سے پوچھا۔

”انجن چلا دو بہن۔“ کریمن نے جواب دیا۔

امین کی ماں نے مشین کے ایک کونے پر لگا ہوا بٹن دبایا اور کارخانے کی مشینیں چلنے لگیں جس سے شیشے کی دیواریں چمکنے لگیں۔ گھوڑے قریب آئے تو ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ رُک گئے۔

”چلو قصّہ پاک ہوا۔ اب تم میری قمیص سی ڈالو۔“ کریمن نے امین کی ماں سے کہا۔ وہ پھر قمیص سینے لگی۔

امین پاس ہی پڑی ہوئی ایک شیشے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ یہاں ہیں تو میں اتنی اونچی جگہ پر نہ چڑھتا۔“

”تمہارے کپڑے تو خراب نہیں ہوئے؟“ ماں نے پوچھا۔ ”اور ہاں پیسے کہاں ہیں؟“

یہ سنتے ہی امین اُچھل پڑا۔ اس کی آنکھ کھُل گئی۔

روپے غائب ہو گئے

امین کی آنکھ اس وقت کھلی جب ٹرین ایک اسٹیشن پر رُک کر چلی ہی تھی۔ وہ سیٹ کے نیچے تھا۔ اس نے سوچا کہ میں نیند میں سیٹ سے نیچے گِر پڑا ہوں گا۔ اس کا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر اُسے آہستہ آہستہ یاد آیا کہ وہ ٹرین میں سفر کر رہا تھا اور کراچی جا رہا تھا۔ ڈبّے

میں ایک کالی ٹوپی والا آدمی بھی تھا۔

"کالی ٹوپی والا۔۔۔!" امین اُچھل کر اٹھ بیٹھا اور آنکھوں کو ملنے لگا۔ کالی ٹوپی والا غائب تھا۔

وہ اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ اُسی وقت اسے پیسوں کا خیال آیا۔ اسے جیب ٹٹولنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اگر پیسے نہ ہوئے تو؟ وہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور خالی سیٹ کو گھورنے لگا، جس پر کالی ٹوپی والا لیٹا ہوا تھا۔

اس نے سوچا میں بے کار شک میں پڑ گیا ہوں۔ جیب میں تو پن لگی تھی۔ اگر کوئی نوٹ نکالتا تو مجھے ضرور معلوم ہو جاتا۔ نوٹ جیب میں ضرور ہوں گے۔ صرف جیب میں ہاتھ ڈالنے کی دیر ہے۔ اس نے جیب کی طرف آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا۔

جیب خالی تھی۔ پیسے غائب تھے۔ اس نے جیب میں دو تین مرتبہ ہاتھ ڈالا۔ پھر دوسری جیبوں کو بھی ٹٹولا۔ لیکن کچھ ہوتا تو مِلتا۔ پِن اب بھی جیب میں لگی ہوئی

تھی۔ اس کی نوک امین کی اُنگلی میں چُبھی تو خون نکل آیا۔

اُس نے انگلی پر رُومال لپیٹا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس لیے نہیں کہ پِن چبھ گئی تھی۔ وہ ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر کبھی نہیں روتا تھا۔ ابھی پندرہ دن ہوئے وہ ایک بجلی کے کھمبے سے ٹکرا کر گِر پڑا تھا۔ جس سے اس کے ماتھے پر چوٹ لگ گئی تھی۔ لیکن وہ اس پر بھی نہیں رویا تھا۔

رونے کی وجہ پیسے اور ماں کا خیال تھا۔ ماں نے پیسا پیسا جوڑ کر کئی مہینوں میں سو روپے جمع کیے تھے۔ اگر وہ سوتا نہیں تو روپے کبھی گم نہ ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ خواب دیکھ رہا تھا تو کالی ٹوپی والے نے اس کے رُوپے چُرا لیے۔ وہ سوچنے لگا، کیا کروں؟ کیا کراچی جا کر نانی سے یہ کہوں کہ میں تو آگیا ہوں لیکن پیسے نہیں لایا۔ اب اُلٹا آپ ہی مجھے کرائے کے لیے پیسے دیں تاکہ میں گھر جا سکوں۔ نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ لیکن پھر کروں کیا؟

اچانک اسے خیال آیا کہ خطرے کی زنجیر کھینچے۔ اس نے پہلے کبھی ٹرین میں سفر نہ

کیا تھا لیکن سُنا ضرور تھا کہ اس طرح چلتی ٹرین رُک جاتی ہے۔

جب ٹرین آئے گی تو گارڈ بھاگا بھاگا آئے گا اور اس سے پُوچھے گا کہ کیا بات ہوئی ؟وہ اُسے بتائے گا کہ رُوپے گُم ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر گارڈ کو اس بات کا یقین نہیں آیا تو؟ تو پِھر اُسے پچاس رُوپے جرمانہ دینا پڑے گا۔ کیونکہ جو شخص بِلا وجہ زنجیر کھینچ کر ٹرین روکے اُس پر پچّاس روپے جُرمانہ ہو جاتا ہے۔ وُہ چُپ چاپ بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اب کھڑکی سے باہر مکان اور باغیچے نظر آ رہے تھے۔ اُس کے ساتھ ہی کارخانوں کی چمنیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس نے سوچا کراچی آ گیا ہے۔ گاڑی رُکتے ہی مَیں گارڈ کے پاس جاؤں گا اور اُسے سارا حال سناؤں گا۔

اسٹیشن قریب آ گیا تو اُس نے ٹوپی پہنی اور تھیلا سنبھالا۔ گاڑی آہستہ ہو گئی تھی اور پلیٹ فارم نظر آ رہے تھے۔ قُلی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے تاکہ لوگوں کا سامان اُٹھائیں۔ پھر گاڑی رُک گئی۔

پلیٹ فارم پر ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہُوا تھا جس پر کراچی کینٹ لکھا تھا۔ گاڑی رکتے ہی لوگ اُترنے لگے اور ایسا شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

امین گارڈ کو ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک اسے لوگوں کے ہجوم میں کالی ٹوپی والا نظر آ گیا۔ ارے! یہ تو وہی تھا۔ چور! تو گویا وہ گاڑی سے اُترا نہیں۔ بلکہ اس ڈبّے سے اُتر کر کسی اور ڈبّے میں بیٹھ گیا تھا۔

امین ڈبّے سے کود پڑا اور گیٹ کی طرف لپکا۔ گیٹ پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ بڑی مُشکل سے باہر نکل رہے تھے۔ اِس بھیڑ بھاڑ میں کالی ٹوپی والا امین کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اس نے ہمّت نہ ہاری۔ وہ لوگوں کی ٹانگوں میں سے نکلتا ہوا گیٹ کے قریب پہنچ ہی گیا۔ وہاں اُسے کالی ٹوپی والے دو آدمی نظر آئے۔ یا اللہ ان میں چور کون ہے؟ وہ کِس کا پیچھا کرے؟ ایک ہی وقت میں دونوں کا پیچھا کرنا مُمکن نہ تھا۔ پھر کیا کرے؟ وہ تو اچھّا ہوا کہ دونوں آدمی ایک دوسرے کے قریب قریب چل رہے تھے اور آگے پیچھے ہی گیٹ سے باہر نکلے۔

امین بھی گیٹ سے باہر نکالا اور ایک آدمی کے قریب پہنچا۔ اُسے غور سے دیکھا تو چور وہ نہیں تھا۔ اب رہ گیا دوسرا کالی ٹوپی والا۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے قریب پہنچا تو جھٹ پہچان گیا۔ یہ وہی تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے دِل میں کہا۔

”اب بچ کر کہاں جائے گا۔“

چور کا پیچھا

امین کے دل میں آئی کہ آگے بڑھ کر کالی ٹوپی والے کا ہاتھ پکڑ لے اور چلّا کر کہے۔ ''نِکالو میرے روپے!'' لیکن وہ آدمی ایسا نظر نہ آتا تھا جو شرافت سے کہتا ''بڑی خوشی سے۔ یہ لو۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں آئندہ کبھی ایسا کام نہیں

کروں گا۔"

اب یہی ہو سکتا تھا کہ اس کا پیچھا کیا جائے۔ امین یہ سوچ کر ایک عورت کے پیچھے ہو گیا اور اُس کی آڑ میں چلنے لگا۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر کالی ٹوپی والا رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے بھیڑ میں کِسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ امین عورت کے پیچھے رُک گیا۔ لیکن عورت کالی ٹوپی والے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ امین نے سوچا کہ اس عورت سے کہہ دوں مگر فوراً ہی خیال آیا کہ وہ اس کی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ اگر کرتی بھی تو چور اس سے کہتا۔ "بی بی جی، کیا میں ایک بچّے کے رُوپے چُرا سکتا ہوں۔"

دوسرے لوگ بھی اُلٹا امین ہی کو بے وقوف بناتے۔ وہ کہتے کہ یہ لڑکا جھُوٹ بولتا ہے۔ یہ حیدر آباد سے، کراچی تک اکیلا کس طرح سفر کر سکتا ہے اور اس کے پاس اتنے روپے کہاں سے آ سکتے ہیں؟ آج کل کے بچّے بڑے چالاک ہیں۔ بڑوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی امین غمگین ہو گیا۔ پھر اس کی

نظروں کے سامنے ماں کو مُصیبت کا مارا چہرہ پھِر گیا۔ یہ رقم اُس نے کتنی محنت سے جمع کی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس کی ہمّت بڑھ گئی اور اس نے چور سے روپے واپس لینے کی ٹھان لی۔

کالی ٹوپی والا اب سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ سامنے سے ٹرام آرہی تھی۔ ٹرام آکر رُکی تو کالی ٹوپی والا اس کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ امین کو یہ معلوم نہ تھا کہ ٹرام کہاں جائے گی۔ لیکن اسے تو چور کا پیچھا کرنا تھا۔ وہ بھی تھیلا اُٹھا کر سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرام میں جس طرف سے آئی تھی اسی طرف چل پڑی۔

کاریں اور رکشا ٹرام کے دائیں بائیں تیزی سے گُزر رہے تھے۔ وہ دائیں اور بائیں مُڑنے کا اشارہ کرتے اور سڑکوں اور گلیوں میں مڑ جاتے۔ پیدل چلنے والے بھی بُہت تھے۔ اسی طرح ٹرک، لاریاں اور بسیں بھی اتنی تھیں کہ امین انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی کپڑوں، جوتوں، شیشے کے سامان، عام استعمال کی چیزوں، پھلوں اور کتابوں کی دکانیں ہی دُکانیں نظر آتیں۔ ان پر

اس قدر ہجوم تھا کہ میلے کا گمان ہوتا تھا۔ دُکانیں حیدر آباد میں بھی تھیں۔ لیکن جو ریل پیل یہاں تھی وہ وہاں کہاں۔ یہاں کی ہر بات حیدر آباد سے نرالی تھی۔

امین کا جی چاہا کہ رُک کر ہر چیز کو اچھی طرح دیکھے۔ لیکن یہ اس کا موقع نہ تھا۔ نہ جانے چور کس وقت ٹرام سے اُتر کر غائب ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھو بات ختم ۔ ٹرام میں اتنی بھیڑ تھی کہ کالی ٹوپی اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُسے یہ بھی علم نہ تھا کہ ٹرام کدھر جا رہی ہے اور ناظم آباد، جہاں اس کی نانی رہتی ہیں، کس طرف ہے۔

چور کا پیچھا کرتے ہوئے وہ یہ بالکل ہی بھول گیا تھا کہ اُس کی نانی ٹکٹ گھر کے قریب اُسے تلاش کر رہی ہوں گی اور جب وہ نہیں ملا ہو گا تو وہ پریشان ہو گئی ہوں گی۔ وہ انہیں کِس طرح خبر کرے کہ وہ کراچی پہنچ گیا ہے اور مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔

امین انہی خیالات میں گُم تھا کہ ٹرام رُک گئی۔ وہ چونک پڑا۔ بہت سے لوگ

سوار ہوئے لیکن اُترا کوئی نہیں۔ اِس سے اُسے تسلّی ہوئی کہ کالی ٹوپی والا ٹرام میں موجُود ہے۔

ٹرام لوگوں سے اتنی بھر گئی تھی کہ امین بھیڑ میں دب گیا۔ اچانک اس کی نظر کنڈکٹر پر پڑی جو مُسافروں سے کرایہ وصول کر کے انہیں ٹکٹ دے رہا تھا۔

''ارے، میرے پاس تو کرائے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔'' یہ خیال آتے ہی امین کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ ''کنڈکٹر مجھے ٹرام سے اُتار دے گا۔ پھر کیا ہو گا۔ اِدھر کا رہوں گا نہ اُدھر کا۔''

اس نے اِرد گِرد کھڑے ہوئے مُسافروں کی طرف دیکھا۔ وہ سب اپنے آپ میں مَست تھے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا، کوئی اپنے ساتھی سے کاروبار کا رونا رو رہا تھا۔ کوئی اُونگھ رہا تھا۔ غرض امین کی طرف کسی کا بھی دھیان نہ تھا۔

دو آدمی ایک بینک کی ڈکیتی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا ''ڈاکو سرنگ کھود کر بینک میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک تنکا تک نہ چھوڑا۔

سارا بینک لُوٹ کر لے گئے۔" دوسرا بولا۔ "جن لوگوں نے بینک کے سیف لے رکھّے تھے ان کے مزے ہو گئے۔ وہ تو کہیں گے کہ ہم نے اس میں ہیرے اور جواہرات رکھے تھے۔ چاہے انہوں نے انعامی بانڈ اور نقلی سونے کے زیور ہی کیوں نہ رکھّے ہوں۔"

دونوں آدمی ہنسنے لگے اور اور امین سوچنے لگا کہ یہی حال میرا ابھی ہے۔ مجھ پر بھی کوئی یقین نہ کرے گا کہ میرے اس چورانوے روپے تھے۔ اے خُدا، یہ مجھے کسی گناہ کی سزا ملی ہے؟

اسی وقت کنڈکٹر کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ "بے ٹکٹ کوئی نہ ہو۔ ٹکٹ لیجئے۔"

کچھ لوگوں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور پیسے نکال کر کنڈکٹر کو دیے۔

"تمہارا ٹکٹ ہو گیا؟" کنڈکٹر نے اس سے پوچھا۔ "جی۔۔۔جی۔" وہ گھبرا کر بولا۔ "میرے پیسے گم ہو گئے ہیں۔"

”پیسے گُم ہو گئے ؟ ہوں۔“کنڈ کٹر نے کہا۔”یہ کہانی میں روز سنتا ہوں۔ تمہیں جانا کہاں ہے ؟“

”مجھے۔۔مجھے۔۔“امین کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

”خیر، کہیں بھی جانا ہو۔ اگلے سٹاپ پر اُتر جانا۔“کنڈ کٹر بولا۔

”لیکن مجھے تو آگے جانا ہے۔“ امین یہ کہہ کر رو پڑا۔ کنڈ کٹر لال پیلا ہو کر بولا۔ ”آگے جانا ہے تو کرایہ نکالو ورنہ اُتر جاؤ۔“

اِرد گرد بیٹھے ہوئے مسافر اِن دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک شخص نے کنڈ کٹر سے کہا۔”اسے ایک ٹکٹ دے دو۔“یہ کہہ کر وہ جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

”آپ نہیں جانتے صاحب۔ یہ لڑکے بہت تیز ہوتے ہیں۔“کنڈ کٹر ٹکٹ کاٹتے ہوئے بولا۔”ہم لوگوں کو ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان کے پاس پیسے ہوتے ہیں لیکن ٹکٹ نہیں لیتے۔ بعد میں کہتے ہیں، کیسا بے وقوف بنایا کنڈ کٹر کو۔“

”یہ لڑکا ایسا معلوم نہیں ہوتا۔“ اس آدمی نے کہا۔

امین نے اس آدمی سے کہا۔ ”آپ کا بُہت شکریہ جناب۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ آدمی بولا ”آئندہ بس یا ٹرام ہیں اسی وقت بیٹھنا جب جیب میں پیسے ہوں۔“

ٹرام سٹاپ پر رُکی تو امین اُٹھ کر دیکھنے لگا کہ کالی ٹوپی والا اُترا ہے یا نہیں۔

وہ اپنی جگہ پر پھر بیٹھ گیا اور اس آدمی سے جس نے اُسے ٹکٹ خرید کر دیا تھا، کہنے لگا۔ ”آپ مجھے اپنا پتہ دے دیجیے۔“

”کیوں؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”میں گھر جا کر آپ کو پیسے بھیج دوں گا۔“ امین نے کہا۔ ”میں یہاں ایک ہفتہ رہوں گا۔“

وہ آدمی زور زور سے ہنسنے لگا اور دوسرے مسافروں سے بولا۔

”کہتا ہے، اپنا پتا دے دیجیے، میں گھر جا کر آپ کو پیسے بھیج دوں گا۔ بچّہ نیک معلوم ہوتا ہے۔“

دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

”بیٹے، اور پیسے چاہئیں تو لے لو۔“ اُس آدمی نے امین سے کہا۔

”جی نہیں شکریہ۔ مجھے اور نہیں چاہئیں۔“ امین نے جواب دیا۔

ٹرام رُکتی رہی اور چلتی رہی۔ اب مسافروں کی بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ امین چور پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب یہ اُترے گا تو میں اس کے پیچھے پیچھے جاؤں گا اور اس کا گھر دیکھ لوں گا۔ میں اس سے اپنے پیسے ضرور واپس لوں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔

نانی کی پریشانی

اِدھر امین ٹرام میں کالی ٹوپی والے کا پیچھا کر رہا تھا اور اُدھر اس کی نانی حمیدہ کو لیے اسٹیشن کا کونا کونا چھانتی پھر رہی تھی لیکن امین کا کہیں پتا نہیں تھا۔

آخر حمیدہ نے کہا۔ ”نانی، امین بھائی شاید آئے نہیں۔ آتے تو مل نہ جاتے۔“

”پتا نہیں یہ کون سی گاڑی آئی ہے۔ جاؤ پتا تو کرو جا کر۔ حیدر آباد والی گاڑی آئی یا

نہیں۔“

”کس سے پوچھوں؟“حمیدہ نے کہا۔

”وہ جو نیلی وردی والا بابو کھڑا ہے نا، اس سے پوچھو کہ حیدر آباد والی گاڑی کب آئے گی۔“نانی نے بتایا۔

حمیدہ گیٹ پر پہنچی اور نیلی وردی والے بابو سے کہنے لگی۔”حیدر آباد والی گاڑی کی آئے گی؟“

اُس نے کہا۔”وہ تو کب کی آچکی۔ یہ مُسافر اسی کے تو ہیں۔“

”اچھا!“حمیدہ نے حیرت سے کہا۔”آپ نے کسی لڑکے کو باہر نکلتے دیکھا ہے؟“

”بُہت سے لڑکے یہاں سے گزرے ہیں۔“ بابو نے ہنس کر کہا۔

”اس کا نام امین ہے۔“حمیدہ بولی۔

بابو کی ہنسی رُکنے میں نہ آتی تھی۔ وہ بڑی مُشکل سے بولا۔

”مُنّی ہم مُسافروں کے نام نہیں پوچھا کرتے نہ اُن کی تصویر اُتارتے ہیں۔
سمجھیں؟“

حمیدہ کو غصّہ آ گیا اور وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

”گاڑی تو دیر کی آچکی ہے۔“ اس نے نانی سے کہا۔

”ہیں!“ نانی نے اپنی عینک سنبھالتے ہوئے کہا۔

”تو امین کہاں چلا گیا؟ اگر اسے نہ آنا ہوتا تو سعیدہ تار بھیجتی۔ کہیں وہ غلطی سے
راستے میں تو نہیں اتر گیا! ہم نے تو اسے صاف صاف لکھا تھا کہ اسے کہاں اُترنا
ہے اور ہم لوگ کس جگہ اُسے ملیں گے۔“

”آپ کہتی تھیں کہ وہ بڑا عقل مند لڑکا ہے۔“ حمیدہ نے چوٹ کی۔ اس کی ماں
اور نانی ہر وقت امین کی عقل مندی کی تعریفیں کرتی رہتی تھیں۔ اس سے حمیدہ
چِڑ جایا کرتی تھی۔

”یا اللہ اب کیا ہو گا؟“ نانی ہاتھ مل کر کہنے لگیں۔

پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے۔

”اب انتظار کرنے سے کیا فائدہ؟“ حمیدہ نے اُکتا کر کہا۔

”ذرا ایک نظر اور ڈال لو پلیٹ فارم پر۔“ نانی نے کہا اور حمیدہ منہ بناتی ہوئی چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ لوٹی اور بولی۔ ”وہ تو خالی پڑا ہے، چلیے اب گھر چلیں۔“

”چلو۔“ نانی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

وہ گھر پہنچے تو سعیدہ کی والدہ اور والد ان کا انتظار کر رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ سُنا کہ امین اس گاڑی سے نہیں اُترا تو اُن کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ حمیدہ کے والد نے کہا کہ امین کی ماں کو فوراً تار دیا جائے لیکن حمیدہ کی والدہ نہ مانیں۔ وہ کہنے لگی۔ ”خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ اس کی تو جان ہی نکل جائے گی۔ دوسری

گاڑی بھی دیکھ لی جائے۔ شاید اس سے آ جائے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" نانی نے کہا۔ "میرا تو دل بیٹھ رہا ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

ننھے جاسوس

ٹرام صدر کے جنکشن پر پہنچ کر رُک گئی۔ سب مسافر اُترنے لگے۔ کالی ٹوپی والا بھی اُترا۔ اُسے دیکھ کر امین بھی اُترا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

کالی ٹوپی والا بوہری بازار کی طرف ہو لیا اور وہاں جا کر قریب کے ایک ہوٹل میں گھُس گیا۔ امین بھی دُکانوں کی آڑ لیتا ہوا ہوٹل کے قریب پہنچا۔

ہوٹل کے پاس ہی، کونے پر، اخبار کی ایک دُکان تھی۔ جس پر بُہت سے رسالے اور اخبار لٹکے ہوئے تھے۔ اُن کی آڑ میں چھپنے کا بہت اچھا موقع تھا۔ امین ایک کونے میں ہو گیا، سر سے ٹوپی اتار لی اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے؟

کالی ٹوپی والا ہوٹل میں کھڑکی کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا اور بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اُسے دیکھ کر امین کو سخت غصّہ آیا۔ چور تو مزے میں تھا اور بے چارہ لُٹنے والا مصیبت میں۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کئے پیچھے موٹر کا ہارن اس زور سے بجا کہ وہ اُچھل پڑا۔ اُس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو اُسی کی عمر کا ایک لڑکا کھڑا ہنس رہا تھا۔

”ڈر گئے؟“ اس نے کہا۔

”میں سمجھا کہ کار آگئی ہے۔“ امین نے جواب دیا۔ اس پر وہ لڑکا پھر ہنسنے لگا۔

”تم اس محلّے کے معلوم نہیں ہوتے کیونکہ مجھے اور میرے ہارن کو یہاں سب جانتے ہیں۔“

”میں حیدر آباد سے آیا ہوں۔“ امین نے جواب دیا۔ ”ابھی ابھی سیدھا اسٹیشن سے چلا آرہا ہوں۔“

”تب ہی تو تمہارے کپڑے گنواروں جیسے ہیں۔“ لڑکے نے کہا۔

”ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔“ امین کو غصّہ آگیا۔

”زیادہ جوش میں مت آؤ۔“ ہارن والے لڑکے نے کہا۔ ”آج گرمی زیادہ ہے، پھر بھی اگر تم لڑنا ہی چاہتے ہو تو میں تیّار ہوں۔“

”میں خواہ مخواہ لڑنا نہیں چاہتا۔“ امین نے کہا اور اس نے ہوٹل پر نظر ڈالی۔ کالی ٹوپی والا وہاں موجود تھا۔

”میرا خیال ہے تمہیں کوئی کام نہیں ہے۔“ ہارن والے لڑکے نے کہا۔ ”تم یہاں بہت دیر سے کھڑے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کسی سے چھُپ رہے ہو۔“

”میں ایک چور کا پیچھا کر رہا ہوں۔“ امین نے کہا۔

”کیا؟“ ہارن والا لڑکا چلاّ اُٹھا۔ ”چور! اس نے کیا چُرایا؟ کِس کی چوری کی؟“

”میری“ امین نے جواب دیا۔ ”اُس نے ٹرین میں میرے چورانوے روپے نکال لیے جو مجھے اپنی نانی کو دینے تھے۔ وہ ناظم آباد میں رہتی ہیں۔ اب میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ وہ دیکھو وہ اس ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ کتنا خوش نظر آتا ہے۔ وہ ہے۔۔۔ کالی ٹوپی والا۔“

”واہ، کیسی مزے کی بات ہے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”مجھے خُود نہیں معلوم۔“ امین نے جواب دیا۔ ”یوں ہی اس کا پیچھا کرتا رہوں گا۔“

”تم پولیس سے کیوں نہیں کہتے؟“ لڑکے نے کہا۔

”اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔“ امین بولا۔ ”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”ہوں۔۔۔“ لڑکا سمجھ گیا۔

نانی اسٹیشن پر میری راہ تک رہی ہوں گی۔“ امین نے اُداس ہو کر کہا۔

لڑکے نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگا۔ ”چور کا پیچھا کرنا اور اُسے پکڑنا بڑے مزے کی بات ہے۔ اگر تُم کہو تو میں بھی تمہاری مدد کروں؟“

”نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔“ امین خوشی سے بولا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”میرا نام رُستم ہے۔“

”اور میرا امین۔“ امین نے کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔

”ہمیں کام شروع کر دینا چاہیے۔“ رُستم نے کہا۔ ”تمہارے پاس کُچھ پیسے ہیں؟“

”ایک پیسا بھی نہیں۔“ امین نے کہا۔

رُستم سوچ میں پڑ گیا۔

"تمہارے دوست نہیں ہیں؟" امین نے پوچھا۔ "وہ بھی آجاتے تو اچھا تھا۔"

"خیال تو اچھا ہے۔" رستم بولا۔ "مجھے صرف دو چار گلیوں میں ہارن بجانا پڑے گا اور ہماری ساری فوج جمع ہو جائے گی۔"

"تو جاؤ۔" امین نے کہا۔ "لیکن دیر نہ لگانا۔ ورنہ وہ بدمعاش غائب ہو جائے گا۔"

رُستم بولا۔ "میں چٹکی بجانے میں آتا ہوں۔ ابھی تو وہ کھا رہا ہے۔ جلدی نہیں اُٹھے گا۔ مجھے تو ایسا موقع پہلی مرتبہ مِلا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیر کی طرح ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

امین نے اطمینان کی سانس لی۔ اب اُسے پیسے مِلنے کی کُچھ اُمّید ہو گئی تھی۔

پانچ منٹ کے بعد امین کو ہارن کی آواز آئی۔ ہارن والے کے پیچھے پیچھے کوئی دو درجن لڑکے چلے آرہے تھے۔

"ہالٹ!" رُستم نے قریب آکر زور سے کہا۔ پھر اُس نے امین سے پوچھا۔ "کیوں کیسا رہا؟"

"بہت بڑھیا۔" امین خوش ہو کر بولا۔

"اچھا تو دوستو، یہ ہے امین۔ ہمارا حیدر آباد کا دوست، اور وہ ہے بد معاش جس نے اس کے پیسے چُرائے ہیں۔ وہ کالی ٹوپی والا۔" رُستم نے ہاتھ کے اشارے سے

بتایا۔ ”اب اسے پکڑنا ہمارا کام ہے۔“

”ہم اسے جانے دیتے ہیں بھلا؟“ ایک عینک والے لڑکے نے کہا۔

”ہم اسے کپتان کہتے ہیں۔ یہ ہمارا لیڈر ہے۔“ رُستم نے عینک والے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس کے بعد اس نے لڑکوں کا باری باری نام بتایا۔

”اچھا، اب کام شروع ہو جائے۔“ کپتان بولا۔ ”سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ ہمارے پاس پیسے کتنے ہیں۔“

سب لڑکوں نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور کپتان انہیں جمع کرتا گیا۔ ایک چھوٹے سے لڑکے کے پاس، جسے وہ مُنّا، کہتے تھے، ایک روپیہ نکلا۔ وہ خُوشی سے اُچھل رہا تھا۔

”کُل پانچ روپے آٹھ پیسے ہُوئے۔“ کپتان نے کہا۔ ”انہیں تین حصّوں میں تقسیم کر لیں تا کہ اگر الگ الگ ہونا پڑے تو کام آئیں۔“

اِسے اور امین کو دو دو روپے دیے گئے اور باقی پیسے رُستم کو ملے۔

"چور کو پکڑتے ہی میں یہ روپے واپس کر دوں گا۔" امین نے کہا۔ "اب کیا کریں؟ میرا خیال ہے کہ یہ تھیلا کہیں رکھ دیتے تو اچھا تھا۔"

"لاؤ مجھے دو۔ میں اسے اپنے گھر رکھ آتا ہوں۔" رُستم نے کہا۔ "جاتے ہوئے اس کم بخت کو بھی دیکھتا جاؤں گا۔"

"ذرا ہوشیاری سے۔" کپتان نے کہا۔ "اگر اُسے شُبہ ہو گیا کہ اس کا پیچھا کر رہے ہیں تو کام خراب ہو جائے گا۔"

"کیا تم مجھے بُدھو سمجھتے ہو؟" رُستم نے کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

کُچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور بولا۔ "سب ٹھیک ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں چل کر میٹنگ کرنی چاہیئے۔" امین نے کہا۔ "یہاں تو بُہت سارے لوگ ہیں۔"

”مارکیٹ کے پیچھے چلو۔“ کپتان بولا۔ ”دو لڑکے یہیں کھڑے رہیں ۔ اگر وہ جانے لگے گا تو ایک لڑکا آکر ہمیں بتادے گا اور ہم فوراً بھاگ کر آجائیں گے۔““”

یہ سب مُجھ پر چھوڑ دو۔ “رُستم نے کہا۔ ”میں یہاں پہرا دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔“

رُستم نے ایک لڑکے ارشد کو روک لیا اور باقی امین اور کپتان کے ساتھ چلے گئے۔

صلاح مشورہ

سب لڑکے صدر مارکیٹ کے پیچھے والے میدان میں جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں سے یُوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا فیصلہ کرنے آئے ہیں۔

کپتان نے عینک اتاری اور اس کے شیشوں کو صاف کرنے لگا۔

"ہو سکتا ہے کہ ہمیں ٹولیوں میں بٹ جانا پڑے۔" کپتان نے سوچ کر کہا۔ "اس لیے ہمیں کوئی ایسی جگہ چُن لینی چاہیے جہاں سب جمع ہو جائیں۔ کس کا گھر سب سے نزدیک ہے؟"

بارہ لڑکوں نے ہاتھ کھڑے کیے۔

"کوئی ایسا بھی ہے جس کے ماں باپ آج کی رات گھر پر نہ ہوں؟" کپتان نے پُوچھا۔

مُنّا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میرے ابّا اور امّی باہر گئے ہیں۔ گھر میں صرف دادی جان ہیں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" کپتان نے کہا۔ "مُنّے کا گھر ہمارا دفتر ہو گا۔"

"لیکن میں تو خُود گھر پر نہیں ہوں گا۔" مُنّے نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو گے؟" کپتان نے پوچھا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چور کو پکڑوں گا۔“ مُنّے نے جواب دیا۔

”تمہارا گھر پر رہنا ضروری ہے۔ سب سے بڑا کام تو یہی ہے۔“ کپتان نے کہا۔
”اچھا اب تم گھر جاؤ۔“

مُنّا جانا نہ چاہتا تھا۔ لیکن کپتان کا حکم تھا اُسے ماننا پڑا۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

”کچھ لڑکوں کو یہاں بھی رہنا چاہیئے۔“ امین نے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ کپتان بولا۔ ”میں، امین، رُستم، کریم اور منیر چور کا پیچھا کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ وہ رات کو کہاں ٹھہرتا ہے۔ اور ہاں تُراب تمہیں پیغام لانا، لے جانا ہو گا۔ لو بھئی ساری باتیں طے ہو گئیں۔“

”اور کھانے کے بارے میں کیا ہو گا؟“ امین نے پوچھا۔

”چند لڑکے اپنے اپنے گھر سے کھانا لائیں۔“ کپتان نے کہا۔ ”یہ کام کون کرے گا؟“

منیر، جلیل، فرید، بشیر اور منوّر کھڑے ہو گئے اور کپتان کے اشارے پر پانچوں بھاگ کھڑے ہوئے۔

”تم باتیں تو بڑی بنا رہے ہو لیکن یہ نہیں بتایا کہ چور سے پیسے واپس کیسے لو گے؟“ تُراب نے کہا۔ ”کیوں نہ ہم سب مِل کر اس پر جھپٹ پڑیں اور اس سے پیسے چھین لیں؟“

”نہ، نہ“ کپتان جلدی سے بولا۔ ”یہ غلط بات ہے۔ اگر ہم نے اس سے روپے چھینے تو ہم ڈاکو بن جائیں گے اور پولیس ہمیں پکڑے گی۔“

”عجیب بات ہے۔“ تُراب نے کہا۔ ”اگر کوئی آدمی میرے پیسے اُڑا لے اور میں اُس سے چھین لوں تو کیا میں ڈاکو بن جاؤں گا۔“

”کیوں نہیں؟“ کپتان نے کہا۔

”میں نے ایسی بکواس پہلے کبھی نہیں سُنی۔“ تُراب غصّے سے بولا۔

"میرا خیال ہے کپتان ٹھیک کہتا ہے۔" امین نے کہا۔ "اگر میں کسی کو بتائے بغیر اس کے پیسے لے لوں تو یہ چوری ہے، اس سے غرض نہیں کہ پہلے وہ پیسے کس کے تھے۔"

"بالکل سچ کہا۔" کپتان بولا۔ "اچھا خدا کے لیے باتیں بند کرو۔ اب سوچنا یہ ہے کہ چور کو کس طرح پکڑیں؟ ایک بات پکّی ہے۔ ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ چور اپنی مرضی سے ہمیں پیسے واپس کر دے۔ ہم چرائیں گے نہیں اور نہ چھینیں گے۔"

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا۔" تُراب بولا۔ "کہ میں اگر اپنی چیز کسی سے واپس لے لُوں تو یہ چوری کیسے ہوئی؟ جو چیز میری ہے وہ میری رہے گی، چاہے وہ کسی کے پاس یہ ہو۔"

"یہ سمجھانا بہت مشکل ہے۔" کپتان نے کہا۔ "بہُت سے بڑی عمر کے لوگ بھی اسے نہیں سمجھتے۔ کہنے کو تو یہ ٹھیک ہے لیکن قانون کی نظروں میں غلط ہے۔ تم

چوری کے الزام میں پکڑ لیے جاؤ گے۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ، تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ کسی آدمی کا پیچھا کیسے کیا جاتا ہے۔" فخر نے پوچھا۔ "اگر اسے علم ہو گیا تو سارا کام چوپٹ ہو جائے گا۔"

"تمھیں کوئی ایسا آدمی بھی تو چاہیے، جو چور کے ساتھ ساتھ لگا رہے۔" حسن نے کہا۔ "اس کام کے لیے میں ٹھیک رہوں گا۔ میں کُتّے کی آواز بھی نکال سکتا ہوں۔ پولیس کے پاس بھی تو کُتّے ہوتے ہیں۔"

"تمھارے پاس پستول بھی ہونا چاہئے۔" فخر کہنے لگا۔

"ہاں ہاں۔ بندوق بھی چاہیئے۔" کئی لڑکے بولے۔

"بالکل نہیں۔" کپتان نے کہا۔

"میں شرط لگاتا ہوں کہ چور کے پاس پستول ہے۔" تُراب بولا۔

"بھئی یہ تو معاملہ بگڑتا جا رہا ہے۔" امین نے کہا۔ "جو ڈرتا ہے وہ گھر چلا جائے۔"

”تم مجھے بُزدل کہہ رہے ہو؟“تُراب نے آستین چڑھا کر کہا۔

”آرڈر آرڈر۔“کپتان نے حکم دیا۔”تم لوگ تو بالکل بچّوں کی سی حرکتیں کر رہے ہو۔“

”بچّے ہی تو ہیں۔“حسن نے جواب دیا اور سب ہنس پڑے۔

”میں اپنی نانی امّاں کو ایک خط بھیجنا چاہتا ہوں۔“ امین نے کہا۔”وہ گھبرا رہی

ہوں گی۔ ہو سکتا کہ وہ پولیس کو خبر کر دیں۔ کیا کوئی لڑکا میرا خط لے جائے گا؟ ان کا گھر ناظم آباد میں ہے۔"

"میں لے جاؤں گا۔" بختیار نے کہا۔ "جلدی سے لکھ دو اور مجھے بس کے لیے پیسے بھی دے دو۔"

کپتان نے اسے اٹھنّی دی۔ امین نے زمین پر پڑی ہوئی سگریٹ کی خالی ڈبیا اُٹھائی۔ اس کے اوپر والے حصّے کو پھاڑ کر سیدھا کیا اور اس پر لکھا۔

"پیاری نانی امّاں

میں کراچی خیریت سے پہنچ گیا ہُوں لیکن ابھی آپ کے ہاں نہیں آ سکتا۔ مُجھے ایک ضروری کام ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ کام ختم ہونے کے بعد میں فوراً آ جاؤں گا۔

گھر میں سب کو میرا سلام کہیے۔

آپ کا نواسا

امین"

اس کے بعد اس نے سگریٹ کی ڈبیا کے اندر والے کاغذ پر اپنے خالُو کا پتہ لکھا اور بختیار کو دونوں چیزیں دیں۔

"ان کو یہ بالکل نہ بتانا کہ میں کہاں ہُوں، اور میرے اوپر کیا بیتی ہے۔" امین نے کہا۔ "ورنہ مصیبت آجائے گی۔"

"تم فکر نہ کرو۔" بختیار بولا۔ "میں خط دے کر آؤں گا تو ننّھے سے معلوم کر لوں گا کہ تم کہاں ہو۔" یہ کہہ کر وہ سرپٹ بھاگا۔

اتنے میں پانچوں لڑکے اپنے اپنے گھروں سے کھانا لے آئے۔ امین کو بڑے زور کی بھُوک لگی تھی۔ اس نے خُوب سیر ہو کر کھایا۔ "تم لوگ اتنی دیر سے گھروں سے غائب ہو۔ گھر والے کچھ نہیں کہیں گے؟" امین نے حیرت سے کہا۔

”کراچی میں اتنی دیر تک تو بچّے باہر کھیلتے ہی رہتے ہیں۔“کپتان نے جواب دیا۔

”اور میرے والد صاحب تو بہت ہی اچھے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میں خراب لڑکوں میں نہیں کھیلتا، کوئی غلط کام بھی نہیں کرتا۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے۔“

امین یہ سُن کر خاموش ہو رہا۔

”اچھا، اب چھوٹے لڑکے گھر چلے جائیں۔“کپتان نے حکم دیا۔ ”صرف رُستم، کریم اور منیر میرے ساتھ رہیں گے۔“

کوئی بھی لڑکا گھر جانا نہ چاہتا تھا لیکن گھر والوں کے ڈر سے سب کو جانا پڑا۔ وہ ایک ایک کر کے رُخصت ہونے لگے۔

سرائے کے اندر

اتنے میں ارشد بھاگتا ہوا آیا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کپتان بولا۔ ”چلو!“ اور سب لڑکے اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ وہ اتنی تیز دوڑ رہے تھے جیسے دوڑنے کا مقابلہ ہو رہا ہو۔

وہ اخبار کی دُکان کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔ رُستم وہاں کھڑا ہاتھ سے اشارہ کر

رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس گئے۔

"ہمیں دیر تو نہیں ہو گئی؟" امین نے پوچھا۔

"گھبراؤ مت۔" رُستم نے کہا۔ "جب میں کوئی کام کرتا ہوں تو پورا کرتا ہوں۔ وہ دیکھو۔۔۔ سامنے۔"

انہوں نے دیکھا کہ چور فٹ پاتھ پر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے دُکان سے ایک انگریزی اخبار خریدا اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"یہ تو پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔" کریم نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔ اس نے یوں ہی اخبار لے لیا ہے تاکہ اس کی آڑ میں اپنا چہرہ چھپا سکے۔" مُنیر نے کہا۔

"اسے یہ معلوم تو نہیں ہوا کہ تُم اس کی نگرانی کر رہے ہو؟" کپتان نے رُستم سے پوچھا۔

"نہیں۔" رُستم نے جواب دیا۔ "وہ تو ندیدوں کی طرح کھاتا رہا جیسے کئی دِنوں کا بھوکا ہو۔"

"وہ دیکھو۔" امین نے جلدی سے کہا۔

چور نے اخبار کو تہہ کیا اور ایک طرف کو چلنے لگا۔

لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ آخر چور ایک گلی کے نکّڑ پر پہنچ کر رُک گیا۔ کچھ دیر بسوں کے گزرنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر گلی میں داخل گیا۔

کپتان نے رُستم سے کہا۔ "تم اس کے پیچھے جاؤ۔"

یہ سن کر رُستم نے تیزی سے سڑک عبور کی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"وہ شاید سرائے میں ٹھہرے گا۔" کپتان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس گلی میں ایک سرائے ہے۔"

"اور اگر رات کو غائب ہو گیا تو؟" امین نے کہا۔

”میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو گا۔“ کپتان نے کہا۔

”لیکن رات بھر اس کی نگرانی کون کرے گا؟“

رُستم آجائے تو کچھ سوچیں گے۔" کپتان نے کہا۔

"خُدا کرے وہ ہوشیاری سے کام کرے۔" امین نے کہا۔

"وہ بہت ہوشیار لڑکا ہے۔ کریم بولا۔ "ویسے دیکھنے میں بدھو لگتا ہے۔"

"ہم میں سب سے زیادہ چالاک اور نڈر وہی ہے۔" مُنیر نے کہا۔

اتنے میں رستم آتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر سب کے دِل اُچھلنے لگے۔

"کیا خبر لائے؟" کپتان نے کہا۔

"وہ رات سرائے میں گزارے گا۔" رُستم نے جواب دیا۔ "اُس نے رات بھر کا کرایہ بھر دیا ہے اور رجسٹر میں اپنا نام لکھوا دیا ہے۔"

"چلو۔" کپتان نے کہا۔ "اب چل کر مزے سے سو رہو۔ صبح چھ بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"کہیں وہ اس سے پہلے ہی اُٹھ کر رفوچکّر نہ ہو جائے۔" امین بولا۔

”ایسا نہیں ہو گا۔“ کپتان نے کہا۔ ”اس قسم کے لوگ صبح جلد نہیں اُٹھتے۔“

”کپتان ٹھیک کہتا ہے۔“ رُستم نے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ کریم نے کہا۔

”امین تم میرے گھر چلو۔“ کپتان نے امین کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ پھر وہ لڑکوں سے بولا۔

”تم لوگ ٹھیک چھ بجے یہاں پہنچ جانا۔“

”بہت اچھا۔“ لڑکے بولے۔

سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ امین کپتان کے ساتھ ہو لیا۔

لڑکوں کی فوج

کپتان کا نام اسلم تھا لیکن دوستوں میں کپتان کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ان کے گروہ کا سردار تھا اور سب اس کا حکم مانتے تھے۔ تھا بھی وہ بہت ذہین، ہوشیار اور نڈر۔ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کا مکان صدر میں تھا اور اس کے والد وکیل تھے۔

اس نے اپنے والد سے کہا کہ امین اس کا دوست ہے اور آج رات اس کے پاس رہے گا۔ انہوں نے کچھ نہ کہا اور امین مزے سے صاف سُتھرے اور نرم بستر پر لیٹ گیا۔

وہ تھکا ہارا اور پریشان تو تھا ہی، بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ کپتان نے گھڑی میں پر پونے چھ بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ جوں ہی الارم بجا، دونوں دوست ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

جب وہ سرائے والی گلی کے پاس پہنچے تو رُستم اور کریم وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ امین انہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کیسے عجیب و غریب لڑکے تھے، کتنے ہمدرد، جوشیلے اور بہادر۔

”کیوں بھئی، کہیں کھسک تو نہیں گیا ہمارا شکار؟“ کپتان نے پوچھا۔

”سو رہا ہے۔ میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔“ رُستم نے کہا۔

”کسی نے تم سے پوچھا تو نہیں کہ یہاں کیوں گھُوم رہے ہو؟“ امین نے پوچھا۔

"سرائے میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کون کسی کو پوچھا ہے۔" رُستم نے کہا۔ "اور میں تو یہ بھی معلوم کر آیا ہوں کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں سے آیا ہے۔"

"شاباش۔" کپتان نے اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ "تم بہت ہوشیار جاسوس ہو۔"

اب سڑک پر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ رکشا، بسیں اور ٹیکسیاں اڈوں سے نکل آئی تھیں اور اِکّا دُکّا دُکانیں بھی کھل گئی تھیں۔

ابھی وہ کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ مُنیر بھی آ گیا۔ اس نے مُنہ بھی نہیں دھویا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے سیدھا بستر سے اُٹھ کر آ گیا ہے۔

"تم میں سے کوئی جا کر ننّھے کو بتا آئے کہ ہم لوگ یہاں ہیں۔" کپتان نے کہا۔

"میں جاتا ہوں۔" کریم نے کہا اور جلدی چلا گیا۔

اب دِن پوری طرح نکل آیا تھا۔ دکانیں ایک ایک کر کے کھل رہی تھیں اور

سڑک پر کافی رونق ہو گئی تھی۔ کپتان نے رُستم کو سرائے میں بھیجا کہ وہ چور کو دیکھ کر آئے۔

اس کے جانے کے بعد کپتان اور امین باتیں کرنے لگے۔ امین اسے حیدر آباد کی باتیں سُنانے لگا۔ وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ رُستم آگیا۔

"وہ تو گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ ایسے لوگ صبح سویرے نہیں اُٹھتے۔" کپتان بولا۔

اتنے میں کریم بھی آگیا۔

"ننھا تو ساری رات نہیں سویا۔" اس نے کہا۔ "کہتا تھا نیند نہیں آئی۔ یہی سوچتا رہا کہ صُبح کب ہو گی؟"

"اچھا بھئی، اب ڈیوٹیاں لگ جائیں۔" کپتان نے کہا۔ "رُستم، تم اور مُنیر سرائے کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ ہم تینوں یہیں رہیں گے۔ چور سرائے میں

سے نکلے تو فوراً ہمیں خبر کی دینا۔“

وہ دونوں چلے گئے۔ امین اور کپتان نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ انہیں سامنے سے بہت سے لڑکے آتے دکھائی دیے۔

”لو فوج آگئی۔“ کپتان نے کہا۔ ”کہیں یہ کام خراب نہ کر دیں۔“

”مجھے بھی یہی ڈر ہے۔“ امین نے کہا۔

لڑکے قریب آئے تو کپتان نے کہا۔ ”دیکھو تم سڑک کی دوسری طرف ہی رہو۔ اگر چور کو شک ہو گیا تو سارے کیے کرائے پر پانی پھِر جائے گا۔“

”یہ بات لڑکوں کی سمجھ میں آگئی اور وہ سڑک کی دوسری طرف جا کر کھیلنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد بڑھنے لگی۔

اب آٹھ بج رہے تھے۔ کپتان اور امین سوچ رہے تھے کہ چور کو کیا ہو گیا کہ مسافر خانے سے نکلتا ہی نہیں کہ اتنے میں منیر بھاگتا ہوا آیا۔

”وہ آرہا ہے۔“منیر نے آکر بتایا۔

”امین، تم اس دکان کی آڑ میں ہو جاؤ۔“کپتان نے کہا۔

پاس ہی بائیں جانب پان کی ایک دُکان تھی۔ امین لپک کر اُس کی آڑ میں ہو گیا۔

کچھ دیر بعد کالی ٹوپی والا گلی میں سے نِکلا اور بندر روڈ پر آ گیا۔ اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر رُستم تھا۔

نہ جانے سڑک کی دوسری طرف سے لڑکوں نے اسے کیسے دیکھ لیا۔ وہ پھر فٹ پاتھ پر جمع ہو گئے۔

کالی ٹوپی والے کی نظر لڑکوں پر پڑی تو وہ بھی حیران ہوا کہ صبح اتنے لڑکے گھروں سے نکل کر کیا کرنے آئے ہیں۔ پھر پر سوچ کر کہ کھیل کُود کا معاملہ ہو گا، بائیں طرف کر ہو لیا۔

جب وہ امین کے قریب سے گزرا تو امین جلدی سے ساتھ والے ہوٹل میں گھُس

گیا اور جب کالی ٹوپی والا سامنے سے گزر گیا تو وہ فوراً ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اتنے میں کپتان ، رُستم ، کریم اور مُنیر بھی اس کے پاس آ گئے ۔ ان کے پیچھے پیچھے لڑکوں کی فوج چلی آ رہی تھی۔

"ان لڑکوں سے کہو کہ یہاں سے چلے جائیں۔" امین نے کپتان سے کہا۔

"وہ نہیں مانیں گے ۔"کپتان بولا۔"اگر یہاں بم بھی پھٹ جائے تب بھی وہ ایک اِنچ نہیں ہلیں گے ۔"

امین کچھ سوچ کر بولا۔"میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے ۔ کیوں نہ سب لڑکے مِل کر اسے گھیر لیں؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"رُستم نے خوش ہو کر کہا۔

"جب وہ یہ دیکھے گا کہ جہاں بھی جاتا ہے، لڑکوں کی فوج اس کے ساتھ ہوتی ہے تو وہ گھبرا جائے گا اور پھر ہم اس کو پولیس کی دھمکی دے کر پیسے لے لیں گے ۔"

اس بات پر سب لڑکوں کا اتّفاق ہو گیا۔ کپتان نے لڑکوں کو اشارہ کیا اور کالی ٹوپی والے کے گرد منڈلانے لگے۔ لڑکے اُچھلتے کودتے ، ایک دوسرے کو دھکّے دیتے، سیٹیاں بجاتے، گاتے اس کے اِرد گرد چل رہے تھے اور وہ حیران تھا کہ یا اللہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی۔ یہ چھوٹے، بڑے، کالے، گورے، موٹے، دُبلے ،لمبے، ٹھگنے اتنے سارے بچّوں کا سیلاب کہاں سے آگیا؟

دُکان دار ، پھیری والے ، راہ گیر، بسوں اور گاڑیوں کے مسافر بھی حیرت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ سمجھے کہ یہ سکول کے بچّے ہیں اور کالی ٹوپی والا ان کا اُستاد ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھے کہ وہ کوئی پاگل آدمی ہے جسے بچے تنگ کر رہے ہیں۔ کالی ٹوپی والا شرمندہ بھی تھا اور گھبرا بھی رہا تھا۔

اتنے میں ایک گیند پیچھے سے آئی اور اس کے سر سے گزر گئی۔ وہ چونک پڑا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ کسی بچّے کی شرارت تھی۔ لیکن اس نے خاموش رہنے ہی ہیں خیریت سمجھی اور تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے بھی رفتار تیز کر دی۔

”ذرااس کا چہرہ تو دیکھو۔“رُستم نے آہستہ سے کہا۔”ایسا لگتا ہے جیسے وہ چھینک کو روک رہا ہے۔“ یہ سُن کر دُوسرے لڑکے ہنس پڑے۔

”میرے آگے آگے رہنا۔“ امین نے رُستم سے کہا۔”کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے۔“

رُستم سینہ پھلا کر امین کے آگے آگے چلنے لگا۔

کالی ٹوپی والا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آخر لڑکے چاہتے کیا ہیں، چلتے چلتے رُک گیا اور پلٹ کر، جس طرف سے آیا تھا اسی طرف کو ہو لیا۔ لڑکوں نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اب تو اسے پکّا یقین ہو گیا کہ لڑکے اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ لیکن کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اتنے میں کریم کالی ٹوپی والے کے سامنے جا کر جھُوٹ موٹ لنگڑانے لگا۔

”کیا کر رہا ہے یہ؟“کالی ٹوپی والے نے غصّے سے کہا۔”راستہ چھوڑ دو ورنہ پولیس کے حوالے کر دُوں گا۔“

”ضرور کرو۔“ کریم نے کہا۔ ”ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔“

لیکن کالی ٹوپی والے میں اتنی ہمّت کہاں تھی کہ پولیس کو بُلاتا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ راہ گیر مُڑ مُڑ کر اس کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔

اچانک اس کی نظر ایک بینک پر پڑی۔ اس نے لڑکوں کا گھیر توڑا اور ایک کر بینک میں گھُس گیا۔ لڑکوں کے قدم رُک گئے۔

”میں، امین اور رُستم اندر جاتے ہیں۔“ کپتان نے کہا۔ ”تم باہر ٹھہرو۔ جُوں ہی رُستم کے ہارن کی آواز آئے۔ فوراً اندر چلے آنا۔ اپنے ساتھ صرف دس لڑکے لانا۔ دُوسروں کو باہر کھڑا رہنے دینا۔“

یہ کہہ کر کپتان اور رُستم بھی بینک میں چلے گئے۔ امین اتنا جوش میں تھا کہ سانس بھی مشکل سے لے رہا تھا۔ جس وقت کا انتظار تھا وہ آ پہنچا تھا۔ اُس نے دس لڑکے چُن لیے اور باقی لوگوں سے کہا کہ وہ اِدھر اُدھر پھیل جائیں۔
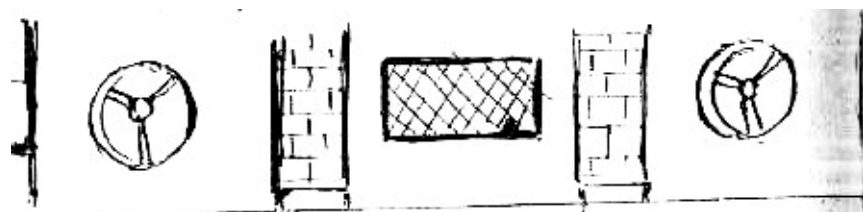
چور پکڑا گیا

کالی ٹوپی والا خزانچی کی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ خزانچی کسی کام میں مصروف تھا۔

کپتان دبے پاؤں گیا اور اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ رُستم بھی اس کے پیچھے پیچھے

تھا۔

خزانچی کام سے فارغ ہوا تو اس نے کالی ٹوپی والے سے پوچھا۔ ”ہاں صاحب، کیا چاہیے آپ کو؟“

”مجھے نوٹ بھنانا ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”روپے روپے کے نوٹ دے دیجیے۔“ یہ کہہ کر اُس نے دس دس روپے کے سات اور پانچ پانچ کے تین نوٹ خزانچی کی طرف بڑھا دیے۔

خزانچی نوٹ لے کر گننے لگا۔

”ٹھہرو۔“ کپتان چلّایا۔ ”یہ نوٹ چوری کے ہیں۔“

”کیا کہا۔“ خزانچی نے چونک کر کپتان کی طرف دیکھا۔ بینک کے دوسرے کلرک بھی کام کرتے کرتے رُک گئے اور کپتان کو دیکھنے لگے۔

”یہ نوٹ اس آدمی کے نہیں ہیں۔“ کپتان نے زور سے کہا۔ ”یہ اس نے چُرائے

ہیں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" کالی ٹوپی والے نے غصّے سے کہا۔ اور یہ کہہ کر اس نے کپتان کے مُنہ پر زور سے چانٹا لگایا۔

کپتان چانٹا کھا کر سنبھلا اور پھر اُس نے کالی ٹوپی والے کے پیٹ میں اتنی زور سے گھونسا مارا کہ وہ لڑکھڑا گیا۔

یہ دیکھ کر بینک کے سارے کلرک جنگلے سے باہر آ گئے۔ رُستم نے زور زور سے ہارن بجا کر اپنے دُوسرے ساتھیوں کو بھی بُلا لیا۔ بینک کا مینجر بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ یہ کیسا شور مچا رکھا ہے؟" مینجر نے پوچھا۔

"جناب، یہ بدمعاش چھوکرے کہہ رہے ہیں کہ میں نے چوری کی ہے۔" کالی ٹوپی والا ہانپتے ہوئے بولا۔

"یہ سن کر امین لپک کر سامنے آ گیا اور بولا۔ "ہاں ہاں، تم نے چوری کی ہے۔ تم نے یہ نوٹ ٹرین میں میری جیب سے نکالے تھے۔ میں حیدر آباد سے آ رہا تھا اور راستے میں سو گیا تھا، ڈبّے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔"

"میں تو ہفتہ بھر سے کراچی میں ہوں۔" کالی ٹوپی والا بولا۔

"جھوٹ، بالکل جھوٹ۔" امین نے چیخ کر کہا۔

"تم ثابت کر سکتے ہو کہ اسی نے تمہارے پیسے چُرائے ہیں۔" مینجر نے پُوچھا۔

"اگر ڈبّے میں تم دونوں اکیلے تھے تو گواہ کہاں سے لاؤ گے؟" ایک کلرک نے کہا۔

امین اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ یکایک امین کو کچھ یاد آیا۔ اور وہ اُچھل کر بولا۔ "ہاں، ایک عورت گواہ ہے۔ وہ میری ماں کو جانتی ہے۔ وہ راستے میں اُتر پڑی تھی۔"

”اس کا نام پتا کیا ہے؟“ مینجر نے پوچھا۔

اس پر امین بغلیں جھانکنے لگا۔ اسے اس عورت کا نہ تو نام معلوم تھا اور نہ پتا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ رُستم بولا۔

”یہ جھوٹ بولتا ہے کہ ہفتہ بھر سے کراچی میں ہے۔ یہ کل ہی آیا ہے۔“

”تم کہاں ٹھہرے ہو؟“ مینجر نے کالی ٹوپی والے سے پوچھا۔

”بندر روڈ کی سرائے میں۔“ اس نے جواب دیا۔

اس پر رُستم اُچھل پڑا اور بولا۔ ”آپ چل کر سرائے کا رجسٹر دیکھ لیجیے۔ یہ کل ہی وہاں گیا ہے۔“

سب لڑکوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ بینک کا خزانچی اور کلرک بھی مسکرانے لگے۔

”بات شک والی ہے۔“ مینجر نے کالی ٹوپی والے سے کہا۔ ”یہ نوٹ یہیں چھوڑ

دو۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک کاغذ لیا اور اس پر کُچھ لکھنے لگا۔

"تمہارا نام؟" مینجر نے کالی ٹوپی والے سے پوچھا۔

"عبدالحمید۔" اس نے بتایا۔

"یہ بھی جھوٹ ہے۔" رُستم چلّایا۔ "سرائے کا رجسٹر دیکھ لیجئے۔ وہاں اس نے فضل محمد لکھوایا ہے۔"

مینجر لکھتے لکھتے رُک گیا اور حیرت سے رُستم کو دیکھنے لگا۔

"یہ بکواس ہے۔" کالی ٹوپی والے نے کہا۔

لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر مینجر سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" مینجر نے اس سے پُوچھا۔

”ملتان میں۔“کالی ٹوپی والے کی اب ہمّت جواب دے رہی تھی۔

”کراچی کیوں آئے؟“ مینجر نے سوال کیا۔

”کچھ سامان خریدنا ہے۔“ اس نے کہا۔ مینجر نے امین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”لیکن تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ نوٹ تمہارے ہیں؟ تم نے ان کے نمبر لکھ لیے تھے۔“

”یہ تو میں نے نہیں کیا۔“ امین نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ انہیں میری جیب سے نکال لے گا؟ لیکن یہ میرے ہیں۔ میری ماں نے دیے تھے کہ ان کو نانی کو دے دوں۔ وہ ناظم آباد میں رہتی ہیں۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ خزانچی نے کہا۔ ”لیکن تُم کوئی نشان تو بتاؤ۔“

”نشانی؟“ امین کا چہرہ اُتر گیا اور وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔

”میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اس کے پیسے نہیں چُرائے۔“کالی ٹوپی والے نے

کہا۔ ”کیا میں اتنا کمینہ ہوں کہ ایک بچّے کے پیسے چُرالوں؟“

”ذرا ٹھہریے۔“ امین جلدی سے بولا۔ ”مجھے یاد آگیا۔ نوٹ ایک لفافے میں تھے اور میں نے اسے آل پِن سے جیب میں لگا لیا تھا۔ نوٹوں میں پِن کا نشان ہو گا۔“

خزانچی نے نوٹوں کو اُوپر اُٹھا کر روشنی میں دیکھا۔ کالی ٹوپی والے کا مُنہ فق ہو گیا۔ مینجر بے چینی سے جنگلے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔

خزانچی نے کہا۔ ”لڑکا ٹھیک کہتا ہے۔ سب نوٹوں میں پِن کے سوراخ ہیں۔“

”اور یہ ہے وہ پِن جو میں نے اِن میں لگائی تھی۔“ امین نے جیب سے آل پن نکال کر مینجر کو دکھائی۔

کالی ٹوپی والا جلدی سے مُڑا اور باہر کی طرف بھاگا۔ اس نے لڑکوں کو اتنے زور سے دھکیلا کہ وہ ایک دوسرے پر گر پڑے۔

”پکڑو جانے نہ پائے۔“ مینجر زور سے چیخا۔

کلرک اس کے پیچھے دوڑے۔ لیکن باہر نِکل کر اُنہوں نے دیکھا کہ چور لڑکوں کی

فوج میں گھرا ہوا ہے۔ کچھ لڑکوں نے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے اور کچھ اس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو چھُڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لڑکے اُس سے جونک کی طرح چمٹ گئے تھے۔

اتنے میں پولیس کا ایک سپاہی بھی آ گیا۔ مینجر نے پولیس والے سے کہا۔ "اس آدمی کو پکڑ لو۔ یہ چور ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خزانچی کی طرف پلٹا اور اس سے بولا۔ "مسٹر داؤد تم یہ نوٹ لے کر ان کے ساتھ تھانے جاؤ اور بچّے کی رپٹ درج کرا دو۔"

پولیس والے نے چور کو پکڑ لیا اور تھانے لے چلا۔ اس کے ساتھ ساتھ بینک کا خزانچی تھا اور اُن کے پیچھے لڑکوں کی فوج۔

تھانے میں

پولیس والا چور کو صدر تھانے میں لے گیا۔ تھانے دار نے ان سے بہت سے سوال کیے۔ پھر رپورٹ لکھی اور اس پر امین کے دستخط لیے۔ تھانے میں صف امین، کپتان، رُستم اور بینک کا خزانچی تھا۔ باقی لڑکے باہر کھڑے تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" تھانے دار نے چور سے پوچھا۔

"مولا داد۔" اس نے کہا۔

خزانچی اور لڑکے ہنس پڑے۔ تھانے دار نے انہیں گھور کر دیکھا تو خزانچی بولا۔ "سرائے میں اس کا نام فضل محمد تھا، بینک میں عبد الحمید اور یہاں مولا داد۔"

یہ سُن کر تھانے دار بھی مُسکرایا اور کہنے لگا۔ "فکر نہ کرو۔ ہم اس کا اصلی نام ابھی معلوم کر لیں گے۔"

"کہاں سے آئے ہو؟" تھانے دار نے پوچھا۔

"ملتان سے۔" اس نے جواب دیا۔

"شکر ہے۔ یہ تو سچ بتایا۔" امین نے کپتان کے کان میں کہا۔

"یہ بھی غلط ہی ہو گا۔" کپتان زور سے بولا۔

"خاموش رہو۔ ابھی سب پتا چل جاتا ہے۔" تھانے دار نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم نے اس لڑکے کی جیب سے روپے نکالے تھے؟"

”میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ حضور مُجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

چور اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”میں تو یہاں کچھ سامان لینے آیا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ لڑکے بد معاشوں کے کسی گروہ سے تعلّق رکھتے ہیں اور مجھے اجنبی دیکھ کر پھنسانا چاہتے ہیں۔“

تھانے دار نے مُسکرا کر کہا۔ ”تم تو بہت بھولے بھالے ہو۔ انہیں تم سے کوئی دُشمنی ہے؟“

یہ سن کر چور سٹپٹایا۔ لیکن فوراً اپنے آپ پر قابو پا کر بولا۔ ”یہ مجھ سے پیسے اینٹھنا چاہتے ہیں۔ آپ میری رپٹ بھی درج کریں۔ میں پردیسی ہوں۔ آپ کو میری مدد کرنی چاہیے۔“

”مدد تو ہم ضرور کریں گے۔“ تھانے دار نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔ ”لیکن اس کی جو حق پر ہو گا۔“

”کیا فائدہ، معاملہ عدالت تک جائے گا۔ وہاں میں بری ہو جاؤں گا۔ آپ کو بھی

ناحق پریشانی ہو گی۔" چور بولا۔

تھانے دار نے گرج کر کہا۔ "میں تم بدمعاشوں کو خُوب سمجھتا ہوں۔ یہ تم کیسے سمجھ لیا کہ عدالت سے بری ہو جاؤ گے۔ تمہارے خلاف پورا ثبوت موجود ہے۔ تین سال جیل کی ہوا کھاؤ گے۔ سمجھے۔"

"مجھے اپنے روپے کب ملیں گے، تھانے دار صاحب؟" امین نے پوچھا۔

"مل جائیں گے۔ بے فکر رہو۔" تھانے دار نے کہا۔

"لیکن اس نے تو ان میں سے بُہت سے پیسے خرچ کر دیے ہیں۔" رُستم بولا۔

تھانے دار مسکرایا اور کہنے لگا۔ "اس کے پاس وُہی روپے تھوڑے ہوں گے۔ اور بھی مال ہو گا۔ ہم ابھی نکلوا لیں گے۔"

امین تھانے میں پہلی مرتبہ گیا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔

"اب کیا ہو گا؟" اس نے تھانے دار سے پُوچھا۔

"اب یہ ہو گا کہ ہم اسے حوالات ہیں بند کر دیں گے اور کل عدالت میں پیش کریں گے۔ تُمھیں بھی وہاں آنا ہو گا اور ان گواہوں کو بھی۔" تھانے دار نے کپتان اور رُستم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بینک کا مینجر اور خزانچی بھی آئے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے رجسٹر پر لکھا اور پھر میز پر رکھے ہوئے نوٹ گِنے۔ دس دس کے سات اور پانچ پانچ کے تین نوٹ تھے۔

"یہ کُل پچاسی ہیں۔" تھانے دار نے چور سے کہا۔ "نو روپے کم ہیں۔ نکالو نو روپے۔"

"میرے پاس نہیں ہیں۔" چور نے کہا۔

"سیدھی طرح نکالو۔" تھانے دار نے غصّے سے کہا۔

"سچ کہتا ہوں حضور، یہی روپے ہیں۔" چور نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

”تو نو روپے خرچ کر دیے۔ کیوں؟“ تھانیدار نے کہا۔

چور خاموش رہا۔ تھانے دار نے روپے امین کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”لو میاں، یہ تو سنبھالو۔ باقی بھی ہم وصول کر کے دے دیں گے۔“

امین نو روپے کم لینے پر آمادہ نہ تھا لیکن اسے یاد آیا کہ ماں نے نانی کو پچاسی روپے ہی دینے کے لیے کہا تھا۔ نو روپے کا جرمانہ اُسے بھگتنا ہو گا۔ وہ کیوں گاڑی میں سو گیا تھا۔ اسے اس غفلت کی سزا ملنی چاہیئے۔ یہ سوچ کر اس نے پچاسی روپے کے لیے۔“ تھانے دار نے اس سے دستخط لیے اور کہا۔ ”کل نو بجے کچہری میں آ جانا اور ان دوستوں کو بھی لے آنا۔ اب اپنا پتا لکھواؤ۔“

”لیکن تھانے دار صاحب، روپے تو مِل گئے اب کچہری میں کیوں آنا ہو گا؟“ امین نے پوچھا۔

”تمہیں اپنے روپے مل گئے لیکن قانون کا کام ابھی باقی ہے۔ چور کو چوری کی سزا ضرور ملنی چاہیئے ورنہ وہ کبھی اس کام سے توبہ نہیں کرے گا۔“

”بہت اچھا تھانے دار صاحب۔ ہم کل کچہری میں حاضر ہو جائیں گے۔“ امین نے کہا۔

”اچھا، اب تم لوگ جاسکتے ہو۔“ یہ کہہ کر تھانے دار نے سپاہی کو حکم دیا کہ چور کو حالات میں بند کر دو۔

امین، کپتان اور رُستم تھانے دار کو سلام کر کے باہر آ گئے۔ باہر لڑکوں کی فوج اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر لڑکوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے اور انہیں گھیر لیا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ چور کا کیا ہُوا؟

کپتان نے انہیں بتایا کہ ”روپے مل گئے ہیں اور چور کو حالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ کل اُسے عدالت میں پیش کیا جائے گا، جہاں اسے قید کی سزا ملے گی۔“

یہ سُن کر لڑکے خوشی سے ناچنے لگے۔ امیں نے سب لڑکوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد امین نے کپتان اور رُستم سے کہا۔ ”مجھے ناظم آباد جانے والی بس میں بِٹھا دو۔ میں اب اپنی نانی کے گھر جاؤں گا۔“

کپتان نے کہا۔ ”کل ہمیں عدالت میں پیش ہونا ہے اس لیے ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ چلیں گے تاکہ تمہاری نانی کا گھر دیکھ لیں اور اگلے دن تمہیں لینے آجائیں۔“

تینوں دوست بس اسٹاپ پر پہنچے اور قطار میں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں بس آگئی اور وہ اس میں سوار ہو گئے۔

راستے میں کوئی مشہور مقام یا سڑک آتی تو کپتان امین کو اس کا نام بتاتا۔ امین حیرت سے بڑی بڑی سڑکوں اور اونچی اونچی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔

ناظم آباد آگیا تو وہ بس سے اُترے۔ خالو کا پتا ان کے پاس تھا ہی۔ انہیں صرف دو مرتبہ پوچھنا پڑا اور پھر گھر مل گیا۔

ایک ہزار روپے انعام

امین نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو کسی کے سلیپر گھسیٹنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔ امین کے سامنے نانی کھڑی تھیں۔ انہوں نے لپک کر امین کو سینے سے لگالیا اور اسے اندر لے گئیں۔

"اچھا، تو وہ ضروری کام ختم ہو گیا؟" نانی نے جھُوٹ مُوٹ ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں خالہ بھی آ گئیں۔ انہوں نے بھی امین کو گلے لگا لیا اور بولیں۔ "لال، تُم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا۔ ساری رات ہمیں نیند نہیں آئی۔ فکر مارے ڈالتی تھی۔ کیا بات تھی؟ کہاں رہے؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" امین کے منہ سے خوشی کے مارے بات نہیں نکل رہی تھی۔ یکایک اس کی نظر ایک دبلی پتلی لڑکی پر پڑی جو دوسرے کمرے کے دروازے میں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ حمیدہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، تم نے پہلے تو نہیں دیکھا اسے کبھی۔" خالہ نے کہا۔

"دیکھا تھا جب یہ اتنی سی تھی اور آپ اسے گود میں لیے حیدر آباد آئی تھیں۔"

یہ سُن کر حمیدہ شرما گئی اور نانی اور خالہ ہنسنے لگیں۔ "چلو، کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھو لو۔" خالہ نے کہا۔

”اور الفت سے ی تک ساری بات بتاؤ۔“نانی بولیں۔

”سب کچھ بتاؤں گا لیکن باہر میرے دو دوست کھڑے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے اس مصیبت سے بچایا ہے۔ آپ کہیں تو انہیں اندر بلا لوں؟“

امین کا یہ کہنا تھا کہ نانی باہر جھانک کر بولیں ”اندر آ جاؤ بیٹو۔“ پھر وہ امین سے کہنے لگیں۔ ”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ باہر تمہارے دوست کھڑے ہیں۔“

کپتان اور رُستم اندر داخل ہوئے تو امین نے ان کا نانی اور خالہ سے تعارف کروایا اور پھر ساری داستان سنائی۔

نانی یہ سُن کر بولیں۔ ”شاباش لڑکو، تم نے بڑے بڑوں کے کان کاٹ دیے۔ ماشاءاللہ بڑے عقل مند ہو اور بہادر بھی۔“

اتنے میں خالہ ایک ٹرے میں مٹھائی اور پھل لے آئیں اور بولیں۔ ”یہ تمہارے لیے منگائے تھے۔ لو کھالو۔“

”ہاجرہ، دیکھا تم نے کیسے بہادر اور سمجھ دار لڑکے ہیں۔“ نانی نے حمیدہ کی ماں سے کہا۔

”بیٹے۔“ خالہ نے کہا۔ ”انہیں اپنے خالُو سے بھی ملوانا۔ وہ ان سے مِل کر بہُت خُوش ہوں گے۔“

”کل ہمیں کچہری جانا ہے۔“ امین منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ مجھے لینے آئیں گے تب خالُو جان سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”اچھا، اب ہم چلے۔“ کپتان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

انہوں نے امین کی نانی اور خالہ کو سلام کیا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دونوں انہیں دُعائیں دینے لگیں۔ امین انہیں باہر تک چھوڑنے گیا اور پھر ہاتھ ملا کر واپس آ گیا۔

”بھئی واہ، تم نے کمال کر دیا۔“ خالہ نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے کہ مجھے ایسے دوست مِل گئے۔“ امین بولا۔ ”ورنہ میں تو یہاں بالکل نیا تھا۔ کیا کر سکتا تھا۔ واقعی یہاں کے لڑکے بہت ہوشیار ہیں۔“

”ہوشیار لڑکے ہر جگہ ہوتے ہیں۔“ خالہ نے کہا۔

”اور نہیں تو کیا۔“ حمیدہ شرارت سے بولی۔ ”سب تمہاری طرح بُدھو تھوڑی ہوتے ہیں۔ گاڑی میں سو گئے۔“

امین کھسیانا ہو گیا۔

”چُپ رہو۔“ خالہ نے حمیدہ کو ڈانٹا اور وہ ہنسنے لگی۔

اچانک امین کو روپے یاد آ گئے۔ اس نے جیب سے پچاسی روپے نکال کر نانی کو دیے اور بولا۔

”امّی نے کہا ہے کہ ہاتھ تنگ تھا اس لیے زیادہ نہ بھیج سکی۔ آپ ناراض نہ ہونا۔“

”اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔“ نانی نے روپے لیتے ہوئے کہا۔ ”سعیدہ

بھی بالکل پگلی ہے۔"

نانی نے نوٹ گنے اور پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ امین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم رکھ لو۔"

"میں۔۔۔؟" امین نے جلدی سے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ "نہیں نہیں۔ میں نہیں لُوں گا۔"

"یہ تمہارا انعام ہے۔" نانی ہنس کر بولیں۔

"جی نہیں۔ میں نہیں لوں گا۔" امین نے کہا۔

"بس باتیں نہ بناؤ۔ خاموشی سے رکھ لو۔" نانی بولیں۔ لیکن امین نے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔

"اگر میں ہوتی تو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ جلدی سے لے لیتی۔" حمد ہنس کر بولی۔

”لیتے ہو کہ نہیں۔“نانی نے حکم دیا۔

”لے لو امین۔ نہیں تو نانی امّاں ناراض ہو جائیں گی۔“ خالہ نے کہا۔

”اچھا، تو۔۔۔لائیے۔“ امین نے ناچار نوٹ لے لیا۔

”دل تو اندر سے چاہتا تھا لیکن نخرے کر رہے تھے۔“حمیدہ فوراً بول پڑی۔

”اچھا بُوجھو تو ہم نے آج کیا پکایا ہے؟“حمیدہ نے پُوچھا۔

”مجھے کیا معلوم۔“ امین نے کہا۔

”تمہیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے؟“حمیدہ بھلا اسے کب چھوڑتی تھی۔

”بھیجا۔“ امین نے غصّے سے کہا۔

”بالکل وہی۔“حمیدہ تالیاں بجا کر ہنسنے لگی۔”ہم نے مغز پکایا ہے۔“

”ہیں۔۔۔!“ امین کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اسے سب سے زیادہ مغز پسند تھا۔ اور یہ بات نانی اور خالہ کو بھی معلوم تھی۔ اسی لیے انہوں نے مغز پکایا تھا۔

"اب اسے زیادہ پریشان نہ کرو۔" خالہ نے حمیدہ سے کہا۔ "بے چارہ کراچی آتے ہی مُصیبت میں پھنس گیا۔"

"اور گھر پہنچ کر یہ مُصیبت گلے پڑ گئی۔" امین نے حمیدہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

امین نے تھیلے میں سے قمیص پاجامہ نکالا، منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر حمیدہ نے امین سے کہا۔ "آؤ تمہیں باہر کی سیر کرا لاؤں۔"

"جلدی آنا۔ تھکا ہوا ہے۔ اِسے آرام کی ضرورت ہے۔" نانی نے کہا۔ دونوں باہر نکلے تو حمیدہ بولی۔ "میں نے سائیکل چلانی سیکھ لی ہے۔"

’’سچ؟‘‘ امین کو افسوس ہوا کہ اُسے سائیکل چلانا نہیں آتی۔

’’تم سیکھو گے؟‘‘ حمیدہ نے پُوچھا۔

’’کیوں نہیں۔‘‘ امین بولا۔

’’یہاں پاس ہی دکان ہے۔ کرائے پر ملتی ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ایک گلی میں مُڑ گئی۔

دُکان سے سائیکل لے کر دونوں گھر کے پیچھے ایک میدان میں گئے اور امین سائیکل چلانے کی مشق کرنے لگا۔ وہ پیڈل پر پاؤں رکھ کر چلاتا تو گِر پڑتا۔ کُچھ دیر تک یہی ہوتا رہا۔ پھر حمیدہ نے سائیکل اس سے لی اور تیزی سے چلانے لگی۔

ایک گھنٹا پورا ہو گیا تو وہ سائیکل لوٹانے کے لیے کان پر پہنچے۔ اس وقت دکان پر ایک پولیس کا سپاہی بھی موجود تھا۔ دکان دار کی نظر حمیدہ پر پڑی تو وہ بولا۔ ’’لو آ گئی ان کی لڑکی۔‘‘ پھر وہ حمیدہ سے کہنے لگا۔ ’’یہ تمہارے ہی گھر کا پتا پوچھ رہے ہیں۔‘‘

پولیس والے کو دیکھ کر حمیدہ ڈر گئی۔ لیکن امین آگے بڑھ کر بولا۔ ”کیا بات ہے جناب؟“

پولیس والے نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولا۔ ”اس لڑکے سے ملنا ہے۔“

کاغذ پر امین کا نام اور حمیدہ کے والد کا پتا لکھا تھا۔

”گھر چلیے۔“ اس نے پولیس والے سے کہا۔ ”تھانے دار صاحب نے بھیجا ہے آپ کو؟“

”ہاں میاں، بڑی دیر سے تمہارا گھر تلاش کر رہا ہوں۔“ پولیس والے نے جواب دیا۔

”گھر چل کر بات کریں گے۔“ امین نے کہا۔

وہ چاہتا تھا کہ نانی اور خالہ کے سامنے بات کی جائے۔ اب وہ ان کے گھر آ گیا تھا اس لیے جو بات بھی ہو ان کے سامنے ہونی چاہیئے۔ حمیدہ ان کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ خدا خیر کرے۔ پولیس والا ان کے گھر پہلے تو کبھی نہیں آیا تھا۔ آج کیا بات ہوئی؟ گھر جا کر امین نے نانی اور خالہ کو پولیس والے کے بارے میں بتایا تو نانی نے اسے اندر بلا لیا۔ خالہ دُوسرے کمرے میں جا کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئیں۔

”آپ کے ہاں امین کون ہے امّاں؟“ پولیس والے نے پُوچھا۔

نانی نے امین کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر امین کو اپنے قریب کھینچ لیا اور اُس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بولا۔

"تو یہ ہیں وہ جاسوس صاحب جنہوں نے اتنا بڑا کام کیا۔"

امین سر جھکا کر مُسکرانے لگا۔

"امّاں، اس لڑکے نے آپ کے خاندان کا نام اُونچا کر دیا ہے۔" پولیس والے نے کہا۔ "اس نے جس چور کو پکڑوایا ہے وہ اشتہاری مُجرم ہے۔ اس نے بہت سی چوریاں کی ہیں۔ کئی بینک میں ڈاکا بھی ڈالا تھا۔ پولیس عرصے سے اس کی تلاش میں تھی۔ لیکن وہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں چھُپتا پھرتا رہا۔ اس کی گرفتاری پر حکومت نے ایک ہزار روپے انعام رکھا ہے۔ اب یہ انعام اس ننّھے جاسوس کو ملے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر امین کی پیٹھ ٹھونکی۔ امین، حمیدہ اور نانی حیرت سے پولیس والے کا مُنہ تکنے لگے۔

سپاہی نے امین سے کہا۔ ”بیٹے۔ تمہیں کل کچہری جانے ضرورت نہیں لیکن پولیس سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کل تمہیں بلایا ہے۔ وہاں ضُرور آنا۔“

حیرت اور خوشی کے مارے امین کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے صرف سر ہلا دیا۔

”بیٹی حمیدہ، ماں سے کہو کہ چائے بنائیں۔ سنتری صاحب۔۔۔“ نانی آگے کچھ کہنے والی تھیں کہ پولیس والے نے جلدی سے کہا۔ ”نہ نہ امّاں، تکلیف نہ کریں؟“

”واہ بٹیا، اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ تُم نے خوش خبری سنائی ہے۔ مُنہ تو میٹھا کرو۔“

نانی بولیں۔ پھر وہ حمیدہ سے کہنے لگیں۔ ”یہاں بنانے میں دیر لگے گی۔ جا بھاگ کر ہوٹل والے سے کہہ آ اور کہنا کہ ایک پیسٹری بھی لے آئے۔“

”آپ خواہ مخواہ تکلّف کرتی ہیں۔“ سپاہی نے کہا۔ لیکن اس عرصے میں حمیدہ گھر سے باہر نکل چکی تھی۔

”تو انعام بڑے صاحب دیں گے؟“ نانی نے پولیس والے سے پُوچھا۔

”ہاں وہی دیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”امین کو حکومت سے سرٹیفکیٹ بھی ملے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اخباروں میں اس کی تصویر بھی چھپے۔“

”سچ۔۔۔!“ نانی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

”ہاں امّاں، اس نے بہت بڑا کام کیا ہے۔“ پولیس والے نے کہا۔ ”اتنے خطرناک مجرم کو پکڑوانا کوئی معمولی بات ہے؟“

امین کی خالہ دروازے کی اوٹ سے سب باتیں سُن رہی تھیں۔ ان کے دل میں بھی لڈّو پھُوٹ رہے تھے لیکن پردے کی وجہ سے سامنے نہ آسکتی تھیں۔

اتنے میں حمیدہ ہوٹل کے ملازم کو لے کر آئی۔ اس نے چائے اور دوسری چیزیں تپائی پر رکھ دیں اور نانی نے سپاہی سے کھانے کو کہا۔ سپاہی نے دو ایک دانے پیسٹری کے کھائے اور چائے پی کر چلا گیا۔

اُس کے باہر جاتے ہی خالہ دروازے کی اوٹ سے نِکل آئیں اور امین کا سر اور پیشانی چوم کر بولیں۔ ”سپاہی نے سچ کہا۔ تم نے خاندان کا نام روشن کر دیا۔“

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ امین کے خالُو آ گئے۔“

”ارے تم آ گئے!“ انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا اور امین دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔

”بھئی، تم نے ہماری نیند حرام کر دی۔“ خالُو امین کی پیٹھ تھپتھپانے لگے۔

”ذرا یہ تو سُنیے کہ کیا کارنامہ دکھایا ہے آپ کے بھانجے نے۔“ خالہ بولیں۔

”کیا بھئی، ہم بھی تو سُنیں۔“ یہ کہہ کر وہ کُرسی پر بیٹھ گئے۔ اور امین کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

خالہ نے ساری کہانی شروع سے آخر تک سُنائی۔ خالو حیرت سے مُنہ کھولے سُنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چُکیں تو بولے۔

"ہیں، کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہُوں۔"

"خُواب نہیں، حقیقت ہے۔" خالہ نے کہا۔

"اب کل اس کے ساتھ جا کر پولیس افسر سے ایک ہزار روپے انعام لے آیئے۔"

خالُو نے خوش ہو کر امین کو سینے سے لپٹا لیا۔ نانی بولیں۔ "اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو اُسے کتنی خوشی ہوتی۔"

باپ کا ذکر سُن کر امین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن وہ انہیں پی گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ماں کا خیال آ گیا۔

"امّی کو بھی بُلا لیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔" خالو نے جلدی سے کہا۔ "انعام ملنے کی خوشی میں انہیں بھی شریک ہونا چاہیئے۔ میں آج ہی تار دیتا ہوں۔"

"امین بھائی جان کے دوستوں کو بھی دعوت دینی چاہیئے۔" حمیدہ بولی۔

یہ سُن کر امین اُچھل پڑا۔ اسے اپنے آپ پر غصّہ آیا کہ وہ اپنے دوستوں کو بھُلا بیٹھا تھا۔

"خالُو جان، میں اپنے چھ سات دوستوں کو بُلانا چاہتا ہوں۔ ان ہی کی مدد سے یہ سب ہوا ہے۔" اس نے کہا۔

"ضرور۔ کیوں نہیں۔" خالو نے کہا۔ "تمہیں ان کے گھر معلوم ہیں؟"

"ان میں سے دو تو کل یہاں آنے والے ہیں۔" امین نے جواب دیا۔

"ان کے ذریعے دوسرے بھی آجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری ماں آجائیں تو شان دار دعوت ہو گی۔" خالو نے کہا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے چلے گئے۔ خالہ گھر کا کام کرنے لگیں۔

"آؤ تُمھیں کہانی کی کتاب دُوں۔" حمیدہ نے کہا۔

امین اس کے پیچھے چل دیا۔

اخبار کا دفتر

دُوسرے دِن صبح کو جب سب لوگ ناشتا کرنے بیٹھے تو امین کے خالو نے کہا۔

"آج مجھے چھُٹّی کرنا پڑے گی۔"

"کیوں؟" خالہ نے بے دھیانی میں پوچھا۔

”امین کے ساتھ جانا جو ہے۔“ نانی نے کہا۔

”ہاں، یاد آیا۔“ خالہ نے کہا۔ ناشتا کر کے خالو نے کپڑے بدلے اور کہنے لگے۔
”میں دفتر ٹیلی فون کر دوں۔ امین تُم اتنے میں کپڑے بدل لو۔“

ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔

”یہ کس کی کار کا ہارن بج رہا ہے۔“ خالُو نے کہا۔

اچانک امین کی کُچھ یاد آ گیا۔

”لو، وہ آ گئے۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بھاگا۔

”حمیدہ، دیکھو تو کار میں کون آیا ہے؟“ خالُو نے کہا۔

اس سے پہلے کہ حمیدہ باہر جاتی، دروازہ کھُلا اور امین کپتان اور رُستم کو لے کر اندر آیا۔

”خالُو، یہ ہے کار۔“ امین نے رُستم کو آگے دھکیل کر کہا۔

خالُو کچھ نہ سمجھے تو اس نے رُستم کو اشارہ کیا۔ رُستم نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور زور سے ہارن بجایا۔

خالُو، خالہ، نانی اور حمیدہ سب ہی اُچھل پڑے۔ خالُو کے چہرے سے ناراضی ظاہر ہونے لگی تو امین نے کہا۔ ''اسی ہارن نے مجھے رُستم کا دوست بنایا اور پھر ہم نے چور پکڑا۔''

یہ سُن کر خالو کی ناراضی جاتی رہی۔ وہ ہنس کر بولے۔ ''بڑے شریر ہو تم۔''

امین نے کہا۔ ''کپتان، مُجھے ایک ہزار روپے انعام ملنے والا ہے۔ چور پکڑوانے کا۔ وہ تو بُہت بڑا چور تھا۔''

کپتان اور رُستم اس کی شکل دیکھنے لگے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ اس نے انہیں پولیس والے کے آنے کی داستان سُنائی۔

''لاؤ ملاؤ ہاتھ اس بات پر۔'' کپتان نے ہاتھ بڑھا کر کہا اور جواب میں امین اُس سے لپٹ گیا۔ پھر وہ رُستم سے بھی گلے ملا۔ اب ہمیں کچہری کے بجائے پولیس

افسر کے پاس جانا ہے۔" امین نے کہا۔

"لیکن سپاہی نے کہاں جانے کو کہا ہے؟" خالو نے کہا۔

"اس نے کہا تھا کہ پولیس سُپر۔۔۔ سُپرن۔۔۔" امین سوچنے لگا۔

"پولیس سپر نٹنڈنٹ۔" خالُو نے کہا۔

"جی یہی نام بتایا تھا۔" امیں جلدی سے بولا۔

"تو پھر تیّار ہو جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" خالُو یہ کہہ کر ٹیلی فون کرنے چلے گے۔

"بھئی، یہ تو کمال ہو گیا۔" کپتان نے کہا۔

"لاجواب۔ کمال۔" رُستم نے کہا۔

"امّی آ جائیں تو تُم لوگوں کی شان دار دعوت ہو گی۔" امین نے کہا۔ "دُوسرے دوستوں کو بھی بُلا لینا اور ہاں ننّھے کو ضرور لانا۔"

”ٹھیک ہے۔“کپتان بولا۔

اتنے میں دوسرے کمرے سے خالہ نے آواز دی۔ امین اندر گیا تو دیکھا کہ ٹرے میں چائے، کیک اور بسکٹ رکھے ہیں۔

”اپنے دوستوں کو چائے پلاؤ۔“ انہوں نے کہا۔

وہ چائے پی ہی رہے تھے کہ خالُو آ گئے۔

گھر سے نِکل کر وہ ٹیکسی میں بیٹھے اور سپر نٹنڈنٹ پولیس کے دفتر کی سمت روانہ ہو گئے۔

دفتر پہنچے تو سامنے ہی ایک موٹا سا انسپکٹر بیٹھا نظر آیا۔ خالُو نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو وہ جلدی سے اُٹھا اور ”تشریف لایئے۔“ کہہ کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ یہ چاروں بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔

انسپکٹر نے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ”آ جاؤ۔“

وہ دروازہ کھول کر اندر گیا۔ خالُو اور لڑکے باہر کھڑے رہے۔ انسپکٹر فوراً باہر نکل آیا اور بولا۔ ”اندر چلے جایئے۔“

یہ کہہ کر اس نے امین کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا اور مُسکراتا ہُوا چلا گیا۔

وہ اندر داخل ہوئے تو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔ ”آیئے تشریف رکھیے۔“

وہ کُرسی پر بیٹھ گئے تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے۔ ”ان میں ہیرو کون ہے؟“

خالُو نے امین کی طرف اشارہ کیا تو وہ شرما گیا۔

”بہت خوب۔ ہماری قوم کو تم ہی جیسے بچّوں کی ضرورت ہے۔“

”یہ کہہ کر انہوں نے ایک فائل نکالی اور اُس کے ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ کُچھ دیر بعد انہوں نے فائل ایک طرف رکھ دی۔ اور بولے۔ ”ہوں، ساری بات ریکارڈ میں آچکی ہے۔“

پھر انہوں نے میز کی دراز میں سے ایک بڑا سا لفافہ نکالا اور اسے کھولا تو اس میں

سے ایک چیک اور سرٹیفکیٹ نکلا۔ وہ دونوں چیزیں امین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”یہ رہا تمہارا انعام اور سرٹیفکیٹ۔“

امین کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے بڑی مُشکل سے دونوں چیزیں لیں اور بولا۔ ”آپ کا۔۔ آپ کا۔۔۔ بہ۔۔۔ بہ۔۔۔ بہُت بہُت شُک۔۔۔۔ ریہ۔“

خوشی کے مارے اس کے مُنہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ خالُو کی سانس بھی تیز تیز چل رہی تھی اور کپتان اور رُستم کی تو جیسے سٹّی گُم تھی۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہے تھے۔ اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ صاحب نے امین سے ہاتھ ملایا۔

امین ہمّت کر کے بولا۔ ”جناب، اگر یہ دونوں میری مدد نہ کرتے تو مجھے اتنا بڑا انعام نہ ملتا۔“ یہ سُن کر کپتان اور رُستم کے چہرے سُرخ ہو گئے۔

”اچھا؟“ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔ ”بھئی ان کا کام بھی بتاؤ۔“

امین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کرے۔ خالُو نے اس کی یہ

حالت دیکھی تو کہنے لگے۔ ”میں بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے جو کچھ امین کی خالہ کی زبانی سُنا تھا، حرف بہ حرف کہہ ڈالا۔ اب امین کی بھی ہمّت بندھ گئی تھی۔ وہ بھی درمیان میں بولنے لگا۔ جو بات خالُو بھُول جاتے وہ یاد دلا دیتا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب تمام باتیں سُن کر بولے۔ ”بھئی واقعی۔ تم بھی انعام کے حق دار ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک ہی آدمی کو انعام ملنا تھا۔ خیر، میں اپنی طرف سے یہ معمولی رقم دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا نوٹ نکال کے کپتان کو دیا۔

”آپس میں آدھا آدھا بانٹ لینا۔ تم دونوں سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا۔“

کپتان نے شکریے کے ساتھ نوٹ لے لیا۔

”اب ہمیں اجازت ہے؟“ خالُو نے پوچھا۔

”اجی، ابھی کہاں۔“سپرنٹنڈنٹ صاحب ہنستے ہُوئے بولے۔”ابھی تو اخبار والے آپ کی کہانی سنیں گے۔ انعام کی خبر اور لڑکے کی تصویر اخباروں میں چھپے گی۔“ یہ کہ کرانہوں نے گھنٹی بجائی۔

دروازہ کھلا اور ایک سپاہی اندر آیا۔

”غلام علی، اخباروں کو ٹیلی فون کر دو کہ انعام لینے والا لڑکا آگیا ہے۔ اپنے رپورٹر بھیج دیں۔“سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔

سپاہی ”بہت اچھاجناب“ کہہ کر چلا گیا۔

”اُن سے ذرا ہمّت سے بات کرنا۔“سپرنٹنڈنٹ صاحب نے امین سے کہا۔”بہت اُلٹے سیدھے سوال پوچھتے ہیں یہ لوگ۔“

اس کے بعد وہ امین سے اس کے گھر اور اسکول کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھار درمیان میں امین کے خالو بھی کچھ کہہ دیتے۔

تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازے تک دی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔ ”آ جاؤ۔“

وہی سپاہی اندر آیا اور بولا۔ ”جناب اخبار والے آ گئے ہیں۔“

”انہیں اندر بھیج دو۔“ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔ چند لمحے بعد چار آدمی اندر داخل ہُوئے۔ اُن میں سے ایک کے گلے میں کیمرہ بھی تھا۔

”تشریف رکھیے۔“ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ امین ہے۔ یہ کپتان ہے اور یہ رُستم۔ پھر اُس نے امین سے کہا کہ وہ چیک اور سرٹیفکیٹ اخبار والوں کو دکھائے۔

فوٹوگرافر نے اسے ایک ہاتھ میں چیک اور دوسرے میں سرٹیفکیٹ رکھنے کو کہا اور پھر اس کی تصویر اُتار لی۔ اس کے بعد رپورٹر اس سے سوالات پوچھنے لگے۔ اُنہوں نے اس سے اُس کے خاندان، گھر اور تعلیم کے بارے میں بھی پُوچھا اور اس نے ان کی ایک ایک بات کا جواب دیا۔

اس دوران میں وہ ایک رپورٹر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اِسے میں نے کہیں دیکھا ہے۔

"کیا بات ہے؟ مُجھے کیوں گھور رہے ہو؟" اس رپورٹر نے ہنس کر پُوچھا۔

"شاید آپ ہی نے ٹرام میں میرا کرایہ دیا تھا۔" امین نے کہا۔

رپورٹر نے کُچھ سوچا اور پھر بولا۔ "ہاں، یہ تو یاد پڑتا ہے کہ میں نے کسی لڑکے کا

کرایہ ادا کیا تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ تُم ہی تھے۔"

"اُس دن تو ٹرام میں بغیر ٹکٹ میں سفر کر رہا تھا۔" امین نے کہا۔

"تم نے میرا پتا بھی تو پوچھا تھا تاکہ پیسے واپس کر سکو۔" رپورٹر نے کہا۔

"جی ہاں۔ اسی لیے تو اب تک اس بات کو یاد رکھا ہے۔" امین جھٹ بولا اور سب لوگ ہنسنے لگے۔

"تو آؤ، میں تمھیں اپنا ٹھکانا بتاؤں۔" رپورٹر نے کہا۔ "اچھا، ایس پی صاحب آپ کا بہُت بہت شکریہ۔ ایسی عمدہ خبر دی۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا تو اس کے ساتھی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امین کے خالُو، اور لڑکے ہی اُٹھ بیٹھے۔ سب نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئے۔

"میں تمھیں اپنے اخبار کا دفتر دکھاؤں گا۔" رپورٹر نے امین سے کہا۔

ایک ٹیکسی سامنے سے آتی دکھائی دی۔ رپورٹر نے اُسے روک لیا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی رُستم نے اپنا ہارن بجایا۔ رپورٹر اُچھل پڑا۔ ٹیکسی والا بھی چونک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ سب لوگ ہنس پڑے۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں۔" کپتان نے رپورٹر سے کہا۔

"مجھے قیصر نُورانی کہتے ہیں۔" اُس نے بتایا۔

"کُچھ دیر خاموشی رہی۔ سب اپنی اپنی جگہ کُچھ سوچ رہے تھے۔ یکایک قیصر نُورانی نے ٹیکسی والے سے کہا۔ "بس بھئی یہیں روک لو۔"

ٹیکسی رُک گئی۔ سب اُتر پڑے۔ امین کے خالُو نے کرایہ دینا چاہا لیکن قیصر نُورانی نے اُنہیں روک دیا اور خود پیسے دیے۔ پھر وہ انہیں ایک بہت بڑی عمارت میں لے گیا جس پر بورڈ لگا ہُوا تھا۔ "روزنامہ نوروز۔" بہت سے آدمی بیٹھے کام کر رہے تھے۔ کُچھ لکھ رہے تھے، کچھ پڑھ رہے تھے۔ قیصر نُورانی نے بتایا کہ لکھنے والے "سب ایڈیٹر" ہیں اور پڑھنے والے پروف ریڈر۔ سب ایڈیٹر خبریں بناتے

ہیں اور انہیں کاتبوں کو دے دیتے ہیں جو انہیں ایک خاص کاغذ پر لکھتے ہیں۔
کاتب خبریں لکھ کر پروف ریڈروں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ وہ انہیں پڑھتے
ہیں۔ اگر غلطی ہو تو کاتبوں سے درست کرواتے ہیں۔

ایک کونے میں دو مشینیں چل رہی تھیں۔ جن میں سے کپڑے کے تھان کی
طرح لمبا کاغذ نکل رہا تھا۔ اس پر انگریزی میں کچھ ٹائپ ہو رہا تھا۔ قیصر نُورانی نے

بتایا کہ اس مشین کو ٹیلی پرنٹر کہتے ہیں اور اس پر باہر سے خبریں آتی ہیں۔ خبروں کو الگ الگ کر کے سب ایڈیٹروں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ وہ ان کا اُردُو میں ترجمہ کرتے ہیں اور پھر لکھنے کے لیے کاتبوں کو دے دیتے ہیں۔

مشین کے علاوہ بھی خبریں آتی ہیں۔ کچھ لوگ اس کام کے لیے مقرّر ہوتے ہیں۔ جو شہر میں گھُوم پھِر کہ خبریں جمع کرتے ہیں انہیں رپورٹر کہا جاتا ہے۔ جب پروف ریڈر لکھی ہوئی خبروں کو پاس کر دیتے ہیں تو کچھ لوگ انہیں کاٹ کاٹ کر ایک بڑے سے کاغذ پر چپکا دیتے ہیں۔ اس کام کو کاپی جوڑنا کہتے ہیں۔ یہ کاغذ اخبار کے سائز ہی کا ہوتا ہے۔ خبروں کے ساتھ تصویریں بھی چھاپی جاتی ہیں۔ کاپیاں تیّار ہو جائیں تو انہیں چھپنے کے لیے پریس بھیج دیا جاتا ہے۔

یہ سب باتیں بتا کر قیصر نُورانی اُنہیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں کچھ لوگ تخت پر بیٹھے باریک، سفید کاغذ پر کالی سیاہی سے لکھ رہے تھے۔ قیصر نُورانی نے بتایا کہ یہ کاتب ہیں۔
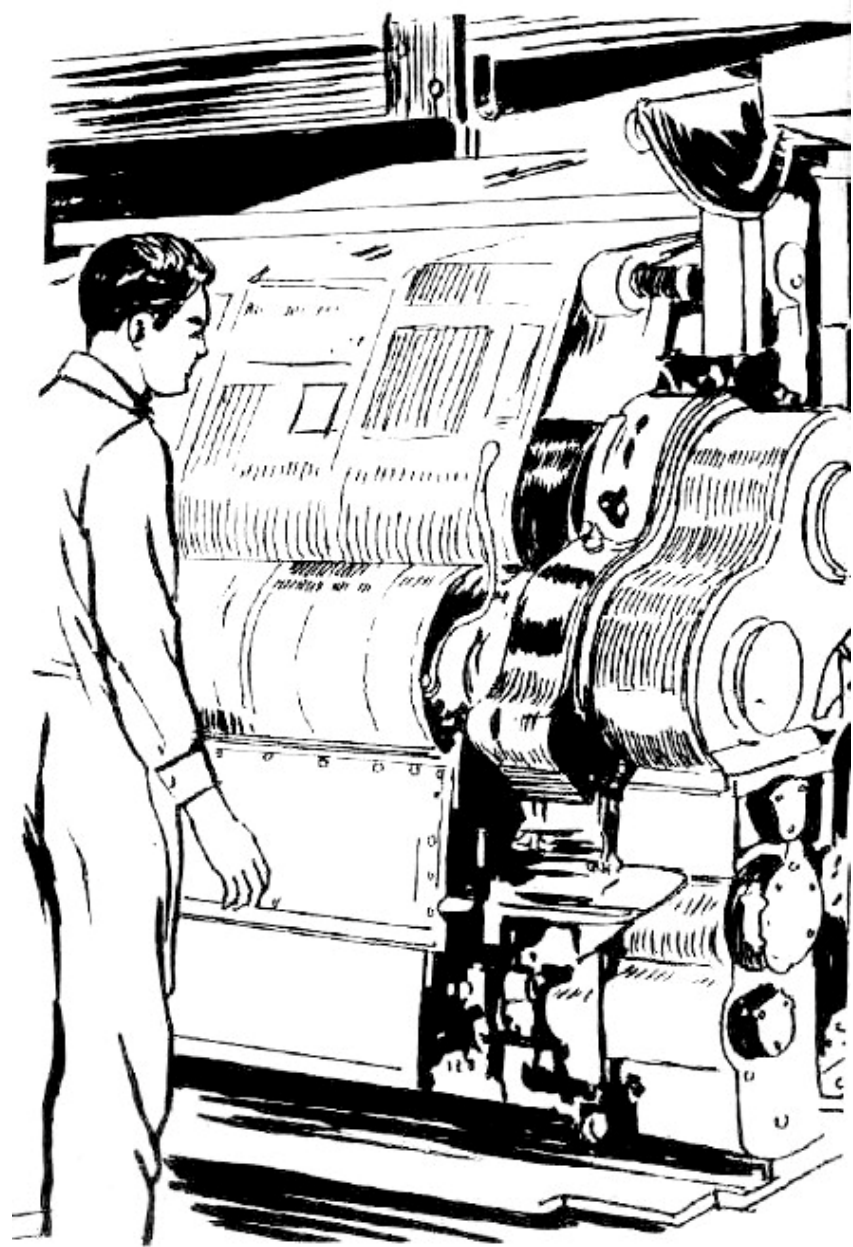
پھر قیصر نُورانی نے انہیں اخبار کے ایڈیٹر، مینجر، خزانچی اور رپورٹروں کے کمرے دِکھائے۔

امین، کپتان اور رُستم سب چیزوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ اخبار کِس طرح چھپتا ہے۔ البتہ امین کے خالُو کو تھوڑا بہُت علم تھا۔

قیصر نُورانی اُنہیں رپورٹروں کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں اس نے ان لوگوں کو چائے پلائی اور وہ شکریہ ادا کر کے رُخصت ہوئے۔

کیا سبق مِلا؟

امین کی ماں اس کے خط کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ وہ صحیح سلامت کراچی پہنچا ہے یا نہیں۔ امین نے زندگی میں پہلی مرتبہ تنہا سفر کیا تھا۔ وہ اس کی سلامتی کی دُعائیں مانگ رہی تھی۔

اُسے یقین تھا کہ امین کراچی پہنچتے ہی اُسے خط لکھے گا لیکن اسے خط کے بجائے

امین کے خالُو کا تار ملا۔ اس نے وہ تار ایک پڑوسی سے پڑھوایا۔ لکھا تھا۔

”امین خیریت سے پہنچ گیا ہے۔ ضروری کام ہے۔ تم فوراً پہنچو۔ عبد القدیر“

عبد القدیر امین کے خالُو کا نام تھا۔ امین کی ماں حیران تھی کہ وہ ضروری کام کیا ہے۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔ امین بیمار نہ پڑ گیا ہو۔ روپے نہ کھو بیٹھا ہو۔ وہ خدا سے دُعا مانگنے لگی کہ اس کا بچّہ خیریت سے ہو۔

وُہ اسی دن دوپہر کی گاڑی سے کراچی روانہ ہو گئی۔ وہ زنانہ ڈبّے ہیں بیٹھی تھی۔ اُس میں پانچ عورتیں اور بھی تھیں۔ ایک عورت کتاب پڑھ رہی تھی۔ باقی باتیں کر رہی تھیں۔ امین کی ماں نے کسی سے بات نہیں کی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھی کھڑکی سے سَر باہر نکالے اپنے خیالوں میں گُم تھی۔ اس کے دماغ میں صرف امین ہی کا خیال تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلدی سے کراچی آجائے۔

اتنے میں گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی اور چیزیں بیچنے والے ڈبّوں کے پاس آ آکر آوازیں لگانے لگے۔ ایک لڑکا اخبار بیچ رہا تھا اور چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ ”ایک

چھوٹے لڑکے نے ایک خطرناک ڈاکو کو پکڑوا دیا۔ آج کی تازہ خبر پڑھیے۔"

ڈبّے میں جو عورت کتاب پڑھ رہی تھی اس نے اخبار خریدا۔ کُچھ دیر بعد اس نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت سے کہا۔ "دیکھو تو کتنا عقل مند اور بہادر لڑکا ہے۔ کتنا بڑا کام کیا۔"

"ہاں بہن، بعض بچّے شُروع ہی سے ذہین ہوئے ہیں۔" دوسری عورت بولی۔ "مثل مشہور ہے، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔"

"صورت سے کتنا بھولا بھالا لگتا ہے یہ لڑکا۔" پہلی عورت نے کہا۔ "کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اِتنا بڑا کام کرے گا۔"

"کہاں رہتا ہے یہ لڑکا؟" ایک اور عورت نے پوچھا۔

"رہنے والا تو حیدر آباد کا ہے لیکن یہ واقعہ کراچی میں پیش آیا۔" اخبار والی عورت بولی۔ "چور نے گاڑی میں اس کی جیب میں سے پیسے نکال لیے تھے۔"

امین کی ماں سب باتیں خاموشی سے سُن رہی تھی۔ لیکن حیدر آباد، کراچی، گاڑی کے الفاظ سُن کر وہ چونکی۔ نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکل گیا۔ ”نام بھی لکھا ہے بہن اس لڑکے کا؟“

”ہاں لکھا ہے۔“ اس عورت نے جواب دیا۔ ”اس کا نام امین ہے۔“

یہ سُننا تھا کہ امین کی ماں اتنے زور سے اُچھلی کہ سیٹ سے نیچے گر پڑی۔ عورتوں نے جلدی سے اسے اٹھایا۔

”ہیں ہیں۔ کیا ہوا بہن؟ کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“ سب عورتیں ایک ساتھ بول رہی تھیں۔

امین کی ماں کے تو جیسے ہوش گُم تھے۔ جب طبیعت قابو میں آئی تو اس نے اخبار مانگا۔ امین کی تصویر پر نظر پڑتے ہی اس نے اسے سینے سے لگا لیا اور بولی۔

”میرا لال۔ میرا بیٹا۔ میرا امین۔“ وہ بار بار یہی الفاظ دہرا رہی تھی اور عورتیں حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

آخر اخبار والی عورت نے کہا۔ ”یہ تمہارا بیٹا ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔ہاں۔۔۔میرا بیٹا ہے۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی۔ ”مجھے پوری خبر پڑھ کر سناؤ۔“ اس عورت نے خبر پڑھنا شروع کی۔ عورتیں درمیان میں شاباش، خُوش رہ بچّے، ماشاءاللہ وغیرہ کہتی رہیں۔

خبر ختم ہوئی تو ایک عورت نے امین کی ماں سے کہا۔ ”بہن مبارک ہو۔ تُم خُوش نصیب ہو کہ ایسا بیٹا اللہ نے دیا۔“

ان ہی باتوں میں کراچی آ گیا۔ امین کی ماں اسٹیشن سے باہر نکلی، رکشا لیا اور ناظم آباد روانہ ہو گئی۔

جب وہ بہن کے گھر پہنچی تو سب لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بہن اور ماں سے گلے مِلی۔ حمیدہ کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور آخر میں امین کو لپٹا لیا۔

”میں نے راستے ہی میں سب کچھ سُن لیا ہے۔“ اب میرے سامنے شیخی نہ مارنا۔“ امین کی ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے سچ!" امین کی خالہ نے کہا۔

"ہاں، اخبار میں سب کُچھ لکھا تھا۔" ماں نے جواب دیا۔

"امّی۔" امین نے کہا۔ "سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ آپ کے لیے ایک نئ مشین اور بجلی کی استری خریدی جائے۔ میں اپنے لیے کہانیوں کی بہت سی کتابیں لُوں گا۔"

"اچھا بابا، دیکھا جائے گا۔" ماں ہنستے ہوئے بولی۔

"میں آپ کو اپنے دوستوں سے بھی ملواؤں گا۔" امین نے کہا۔

"ارے ہاں، کہاں ہیں وہ لڑکے؟" ماں نے پوچھا۔

"ان کی دعوت کرنی ہے۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔" امین نے کہا۔

امین سے فارغ ہو کر اس کی ماں، اپنی بہن اور ماں سے باتیں کرنے لگی اور امین حمیدہ کے ساتھ دعوت کا پروگرام بنانے لگا۔

شام کو خالُو دفتر سے آئے تو ان کی ماں کو دیکھ کے بُہت خُوش ہوئے اور اُسے مبارک باد دی۔ اگلے دن اتوار تھا اس لیے دعوت اسی دن رکھی گئی۔ کپتان، رُستم، مُنیر اور ننّھے کے علاوہ دس بارہ لڑکے اور تھے۔ سب نے خوب مزے سے دعوت اڑائی۔ پلاؤ، قورمہ، کباب، دہی کا رائتہ، آم کی چٹنی اور مربّہ سب ہی کچھ تھا۔ کھانے کے بعد پہلے پھل کھائے گئے۔ پھر سہ پہر کے وقت چائے کے ساتھ مٹھائی کھائی۔

لڑکوں نے خوب پیٹ بھر کے کھایا لیکن کسی نے بدتمیزی نہیں کی۔ اس سے امین کے گھر کے لوگ بہت خوش ہوئے۔

لڑکے چائے پی کر امین سے گلے مِلے اور رُخصت ہو گئے۔ اب صرف گھر کے لوگ رہ گئے تھے۔ امین کے خالُو اُٹھ کر اندر گئے اور انہوں نے سو سو کے دس نوٹ لا کر امین کی ماں کو دے دیے۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ روپے بینک میں رکھ دیے جائیں۔“ اُنہوں نے کہا۔

”امّی کے لیے نئی مشین اور بجلی کی استری ضرور خریدیں گے۔“ امین جلدی سے بولا۔

”تم بچّے ہو۔ تُمہاری ماں خود جو بہتر سمجھے لگی کرے گی۔“ خالُو نے کہا۔

”لیکن مشین اور استری خریدنے میں کون سے سینکڑوں روپے لگیں گے؟“ نانی نے کہا۔ بچّے کی خُوشی پُوری ہو جائے گی۔“

"اچھا، کل بازار چلیں گے۔" امین نے کہا اور اس کی ماں نے سر ہلا دیا۔

"حمیدہ تم بھی چلو گی نا"۔ امین نے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ تم لوگ سیر کرو گے اور میں گھر میں بیٹھی مکھّیاں ماروں گی؟" حمیدہ نے جواب دیا۔

"تمہارے لیے بھی کوئی تحفہ خریدیں گے۔" امین نے کہا۔ اور حمیدہ خُوش ہو گئی۔

خالُو کو کہیں باہر جانا تھا۔ وہ چلے گئے۔ باقی لوگ بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

خالہ کہنے لگیں۔ "سچ ہے، مُصیبت کے بعد راحت آتی ہے۔"

امین نے کہا۔ "مُجھے تو اس مصیبت سے یہ سبق مِلا ہے کہ کسی اجنبی پر اعتبار نہ کرو۔"

اس کی ماں نے کہا "اور مجھے یہ سبق مِلا ہے کہ بچّوں کو کبھی اکیلے سفر نہیں کرنا چاہیئے۔"

”یہ سب فضول باتیں ہیں۔“نانی بولیں۔

”تو آپ کا خیال ہے کہ اس واقعے سے کوئی سبق نہیں ملتا۔“ خالہ نے کہا۔

”ملتا کیوں نہیں۔“ نانی نے جواب دیا۔ ”سبق یہ ملتا ہے کہ روپے ہمیشہ ڈاک خانے کے ذریعے بھیجے جائیں۔ یعنی منی آرڈر کیا جائے۔“

”نانی زندہ باد۔“ امین چلّایا اور سب ہنسنے لگے۔